علی اکبر ناطق کی ادبی جہات

یہ مقالہ

صباحت عروج

رول نمبر:26، سیشن: 19-2017 خزاں نے برائے حصول ڈگری ایم فل اُردو

منہاج یونیورسٹی لاہور (پاکستان) میں پیش کیا

یہ تحقیقی کام، زیر نگرانی

ڈاکٹر مختار احمد عزمیؔ، مکمل ہوا۔

اقرار نامہ

میں صباحت اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میرے اس مقالہ میں کسی قسم کا سرقہ نہیں پایا جاتا۔ یہ میری ذاتی کاوش اور محنت پر مبنی ہے۔ نیز ادبی جہات میں اس سے قبل "علی اکبر ناطق کی ادبی جہات" پر کوئی کام نہیں ہوا۔ یہ مقالہ سپیریئر یونیورسٹی ڈاکٹر مختار عزمی کی زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔ میں حلفاً اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ اس سے قبل یہ مقالہ کسی بھی سند کے لیے کسی اور ادارہ یا یونیورسٹی میں نہیں دیا گیا اور نہ ہی آئندہ دیا جائے گا۔

____

صباحت عروج

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ معلمہ صباحت عروج دختر غلام سرور رجسٹریشن نمبر 2017F-mulmpl-urd-026 نے مقالہ بعنوان "علی اکبر ناطق کی ادبی جہات" برائے ایم فل اردو زیرِ دستخطی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اس تحقیق و تدوین میں کسی سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ تحقیقی اور تدوینی اعتبار سے یہ کام اس قابل ہے کہ اسے زبانی امتحان کے لیے بھجوایا جا سکتا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ حتمی منظوری کے بعد یہ مقالہ اردو تحقیق و تدوین کے میدان میں اہمیت کا حامل ہے۔

دستخط

نام نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر مختار عزمی

انتساب:

والدہ محترمہ لعل بی بی کے نام

جن کی محبت، رہنمائی، اور تعلیم و تربیت کا میرا رواں رواں مقروض ہے

فہرست ابواب

پیش لفظ

عصری ادب کے اُفق پر پچھلی دہائی میں جو شخصیات ابھر کر سامنے آئی ہیں ان میں علی اکبر ناطق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مصنف مذکور نے ادب کی بہت ساری جہتوں میں کام کیا۔ ناول نگاری، افسانہ نگاری، تنقید اور شاعری علی اکبر ناطق کے اہم میدان ہیں۔ اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ علی اکبر ناطق کی ادبی جہات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اُن کے اُسلوب کے چھپے ہوئے گوشے سامنے لائے جائیں۔ کوئی بھی مصنف جو ادب کے میدان میں کئی محاذوں پر صفِ اوّل کا ادیب سمجھا جا رہا ہو اس کی جہات کا مطالعہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا مقالہ بعنوان "علی اکبر کی ادبی جہات" یقیناً اہم ضرورت ہو گی۔

زیر دستخطی کا یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علی اکبر ناطق کی شخصیت کی مخفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں ناطق کی تعلیم، ملازمت، ادبی سفر اور ان کا حلقہ احباب اور نجی زندگی پر بحث کی گئی ہے۔ اور بیان کی تصدیق کے لیے علی اکبر ناطق کے انٹرویو کے حوالے دیے گئے ہیں۔

دوسرا باب " ناطق کی شاعرانہ جہات " ہے۔ اس میں ناطق کی غزل اور اس کی نظم کا فکری جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی شاعری کا موازنہ ان کے ہم عصر شعراء سے کیا گیا ہے۔ نیز معاصرین اور ناقدین کی نظر میں ناطق کی شاعری کا معیار متعین کیا گیا ہے اور فنی و عروضی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان "ناطق کی فکشن نگاری کی جہات " ہے اور اس باب مین ناطق کے افسانے، ناول اور مرقع نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ ناطق ایک افسانہ نگار، ناول نگار، اور مرقع نگار ہیں۔ ان کے فن پر بحث کرتے ہوئے ان کی اصناف کا تقابل بھی کیا گیا اور ناطق بطور افسانہ نگار، بطور ناول نگار اور بطور مرقع نگار کے فن پر تفصیلی بحث کی گئی۔ ان کے افسانے، ناول اور مرقع کا فکری و فنی حوالے سے جائزہ لیا گیا۔

چوتھا باب "ناطق کی تنقیدی جہات " ہے جس میں علی اکبر ناطق بطور نقاد زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ تنقید کی ضروریات پر بات کی گئی اس کے علاوہ تنقید و تخلیق کا رشتہ کیا ہے اور تخلیق کار بطور نقاد کیسے کام کرتا ہے اس پر بحث کی گئی ہے۔

تحقیق کے اس سفر میں میں اپنی والدہ کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنی محبت اور شفقت سے میرے اس تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہر ممکن طریقے سے میری مدد کی۔ اور مجھے ہمیشہ ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ یہ ان کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ میں آج اس کام میں سرخرو ہوئی ہوں۔ مزید بر آں میں استاد نصیر احمد صاحب کی شکر گزار ہوں

۔ جنہوں نے کتب کی فراہمی سے لے کر مقالے کی تیاری تک میری رہنمائی فرمائی۔ میں علی اکبر ناطق صاحب کی بے حد مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے اس مقالے تحقیقی کام میں میری ہر موڑ پر نہ صرف رہنمائی کی بلکہ شفقت سے مجھے تمام تر مطلوبہ مواد بھی فراہم کیا۔ اور میرے کام کو مکمل کرنے میں بھرپور تعاون کیا۔ جن کی معاونت کے بغیر یہ مقالہ مکمل ہونا ناممکن تھا۔ والدین کے بعد اساتذہ وہ ہستی ہیں جو انسان کی کامیابی کی وجہ بنتے ہیں اس حوالے سے میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ڈاکٹر مختار عزمی جیسے استاد ملے جو میرے استاد اور محسن ہونے کے ساتھ ساتھ اس مقالے کے نگران بھی ہیں۔ صدر شعبہ اردو منہاج یونیورسٹی ڈاکٹر مختار عزمی کی پدرانہ شفقت اور علم سے لگن کا ثبوت ہے کہ میں نے یہ مقالہ ان کی سرپرستی میں مکمل کیا۔ ابتداء سے تاحال ہر مرحلے میں رہنما ہونے کا حق ادا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کی سرپرستی اور شفقت کے بغیر میرے اس مقالے کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ مختار عزمی صاحب نے ایم فل کے مکمل پروگرام میں تمام طالبعلموں سمیت میری بھی ہر قدم پر رہنمائی فرمائی، خدا ان کو اس کا اجر دے۔ ان کے لیے ایک شعر۔

اب مجھے مانیں نہ مانیں اے حفیظ
مانتے ہیں سب میرے استاد کو

صباحت عروج

باب اول:

ناطق، شخصیت اور جہات

تعارف:

علی اکبر ناطق ایک شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ پچھلی دہائی میں عصری اردو ادب کے افق پر جو شخصیات اُبھر کر سامنے آئی ہیں ان میں سے " علی اکبر ناطق "نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مصنف مذکور نے ادب کی بہت ساری جہتوں میں کام کیا۔ ناول نگاری، افسانہ نگاری، تنقید اور شاعری علی اکبر ناطق کے اہم میدان ہیں۔ ناطق نے شاعری کے باب میں چار کتابیں لکھی ہیں جن میں تین کتابیں نظم کی ہیں اور ایک کتاب غزل کی ہے۔ نثر لکھتے وقت ناطق نے سب سے پہلے افسانے کا انتخاب کیا۔ ناطق کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک ناول بھی ادبی دنیا میں مقام حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزاد کا ایک مرقع بھی لکھا ہے۔ اور ایک تنقید کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ علی اکبر ناطق نے تمام ادبی اصناف میں اپنا ہنر آزمایا اور وہ اس میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی بھی مصنف جو ادب کے میدان میں کئی محاذوں پر صفِ اوّل کا ادیب سمجھا جا رہا ہو اس کی جہات کا مطالعہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

پیدائش:

علی اکبر ناطق ۱۵ اگست " ۱۹۷۶ء" کو اوکاڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا گاؤں اوکاڑہ کے قریب ہے۔ یہ چک ۳۲- ایل کے نام سے مشہور ہے۔ علی اکبر اسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔

تعلیم:

علی اکبر ناطق نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان اپنے آبائی گاؤں سے پاس کیا۔ اس کے بعد ایف اے گورنمنٹ کالج اوکاڑہ سے کیا۔ اور ناطق نے بہاؤدین زکریا یونیورسٹی سے بی ای کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا۔ ایم اے کی ڈگری نمل یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد علی اکبر ناطق نے ایم فل اردو منہاج یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا۔ آپ نے تمام تعلیم آرٹس میں مکمل کی۔

ان کے گھر کے معاشی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ ناطق کے خاندانی معاشی حالات ٹھیک نہ ہونے کے سبب وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ بچپن سے ہی محنت مزدوری بھی کرتے تھے۔ ناطق نے ایک انٹرویو میں بتایا ان کے معاشی حالات اس قدر خراب تھے کہ ساتویں کلاس تک ان کے پاؤں میں جوتا نہیں ہوتا تھا۔

خاندان:

علی اکبر ناطق کا خاندان تقسیم کے وقت فیروزپور (ہندوستان) سے ہجرت کر کے پاکستان آگیا تھا۔ ان کے والد کا نام "بشیر محمد" ہے۔ جب اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آئے تھے تب ان کے والد کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اس کے بعد ناطق کا خاندان یہیں آباد ہو گیا۔

علی اکبر ناطق نے مختلف انٹرویوز میں بتایا کہ جب ان کا خاندان فیروزپور (انڈیا) سے پاکستان ہجرت کے لیے روانہ ہوا تھا تو کم و بیش "۷۰" لوگ قافلے میں شامل تھے جو خاندان کے لوگ تھے۔ مگر جب ہیڈ سلیمانکی کے راستے پاکستان پہنچے تو تقریباً "۲۰" لوگ بچ گئے جو اپنی جان بچا کر اور راستے کی مشکلات سے نبرز آزما ہو کر پاکستان پہنچے۔ پاکستان پہنچنے پر ناطق کا خاندان اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں بس گیا۔ مگر ان کے پاس کوئی تحریری ریکارڈ یا زمینی کاغذات موجود نہ تھے اور نہ کوئی جائیداد کا ریکارڈ موجود تھا۔ جس وجہ سے ان کے خاندان کو شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ سادہ لوگ تھے اور انہیں تمام معاملات کا علم نہیں تھا۔ ان کے خاندان نے شدید غربت اور پریشانی کا سامنا کیا۔ کیونکہ ان کی تمام جمع پونجی بھی لوٹ لی گئی تھی اور پاکستان میں کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور نہ کوئی سہولت کار موجود تھا۔ ناطق نے علی اکبر ناطق کے والد معمار ہیں انہوں نے معماری کو ذریعہ معاش بھی بنایا اور کئی سال تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ ایک وقت ایسا آیا کی ناطق کی والدہ شدید بیمار ہو گئیں اور تمام جمع پونجی ان پر خرچ ہو گئی۔ تب ناطق کے والد نے مڈل ایسٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایران، عراق، اور شام محنت مزدوری کی غرض سے کچھ سال رہے۔ وہاں کویت اور عراق میں جگہ جگہ معماری کے ٹھیکے کا کام کرتے رہے۔ وہاں اس وقت نئی ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کا رواج فروغ پا رہا تھا۔ ناطق کے والد نے تقریباً چار سال تک وہاں کام کیا اور اس کے بعد پاکستان واپس آگئے اور زمینداری کام سے وابستہ ہوئے یعنی کھیت کھلیانوں میں کام کرنے لگے۔ ان کے والد کی زبانی ناطق نے وہاں کی معاشرت اور ثقافت سنی۔ وہاں کی ثقافت اور زندگی نے ناطق کو متاثر کیا۔ نتیجۃً ناطق بھی مڈل ایسٹ روانہ ہو گئے۔ ان کے والد اور بھائی معماری کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں اور ناطق خود بھی معمار ہیں۔ یعنی معماری ان کا خاندانی کام ہے۔

بہن بھائی:

علی اکبر ناطق کے چھ بھائی اور دو بہنیں ہیں جن میں ایک بہن بڑی ہیں اور دوسری بہن سب بہن بھائیوں سے چھوٹی ہے۔ بھائیوں میں علی اکبر ناطق سب سے بڑے ہیں۔ ان سے چھوٹے چھ بھائی ہیں۔ علی اکبر ناطق کے دو بھائی "آرکیٹیکچر" ہیں۔ کچھ بھائی کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور کچھ معمار ہیں۔ علی اکبر کے چھوٹے بھائی جن کا نام علی اصغر تھا،

ان کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔ علی اکبر ناطق کی سب سے بڑی بہن جن کا نام خدیجہ تھا اور وہ ایک سکول میں استانی تھیں۔ ان کے شوہر نے انہیں قتل کر دیا تھا۔ علی اکبر ناطق نے ایک انڈین جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ ان کی بہن کو ان کے شوہر نے انشورنس کے پیسوں کی خاطر قتل کیا۔

عائلی زندگی:

علی اکبر ناطق کی شادی "۲۰۱۰" میں ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی ہے جس کا نام "وجیہہ فاطمہ" ہے۔

ناطق کی شادی تقریباً پانچ سال رہی اس کے بعد ان کی بیوی کے ساتھ علیحدگی ہو گئی۔ اور "۲۰۱۵" میں ان کی طلاق ہو گئی۔ ان کی بیٹی اپنی والدہ کے ساتھ لاہور میں رہتی ہے۔ ان کی سابقہ بیگم پاک آرمی میں ڈاکٹر ہیں۔ علی اکبر ناطق نے دوبارہ شادی نہیں کی۔

ادبی سفر:

علی اکبر ناطق کا ادب سے تعلق بچپن سے تھا۔ علی اکبر ناطق کے دادا عربی اور فارسی جانتے تھے اور ہجرت کے وقت وہ اپنی کتابیں ساتھ لے کر آئے تھے کہ اس قدر مشکل حالات میں بھی انہیں اپنی کتابوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ پاکستان لانے میں کامیاب ہوئے۔ علی اکبر ناطق نے بتایا کہ وہ بچپن میں اپنے دادا کی کتابیں پڑھتے تھے۔ انہیں کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ناطق نے بتایا کہ " ۱۹۷۹ " میں ان کے گھر کے بالکل پاس ایک ہائیر سیکنڈری سکول کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ایک بڑی لائبریری یونین کونسل کی عمارت میں ترتیب دی گئی جس کا سنگ بنیاد مشہور شاعر "مصطفیٰ زیدی" نے رکھا۔ اس لائبریری میں بہتریں ادبی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ ناطق وہاں کتابیں پڑھنے جاتے تھے۔ اور بقول ناطق انہوں نے بچپن میں ہی اس لائبریری سے "الف لیلہ، داستان امیر حمزہ، بے تال بتیسی، سنگھاسن بتیسی،" وغیرہ جیسی کتابیں پڑھی تھیں۔ ناطق نے بتایا کہ وہ دسویں جماعت تک نصاب کی کتابیں نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ دوسری کتابوں میں اور لائبریری میں ان کی دلچسپی زیادہ تھی۔ ناطق کو بچپن میں ہی بہت ساری کتابوں کے صفحے زبانی یاد تھے۔ جیسے رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد، اور دیگر۔ بھینسیں چراتے ہوئے وہ کتابیں بھی پڑھتے تھے اور اس طرح وہ بچپن سے لڑکپن اور جوانی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ ناطق نے بتایا کہ ان کے گاؤں میں ایک شخص جو ذہنی طور پر معذور تھا، اس کا نام سین تھا اور چلتے چلتے دیوار سے ٹکرا جاتا تھا، کچھ عرصے بعد ناطق کو بھی لوگ سین کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ ناطق چلتے پھرتے ہوئے کتاب پڑھتے اور اس میں اتنا مگن ہوتے تھے کہ کبھی کسی راہ چلتے کے ساتھ اور کبھی کسی دیوار یا کھمبے سے ٹکرا جاتے تھے۔ آج بھی ان کے گاؤں میں ان کے دوست اور گھر والے اسی وجہ سے ناطق کو سین کہتے ہیں۔ ناطق نے یہ بھی بتایا کہ

وہ لائبریری سے کتابیں گرا کر گھر لاتے تھے اور پھر پڑھنے کے بعد وہ کتابیں واپس رکھ آتے تھے اور دوسری چرالاتے تھے۔ کیونکہ اساتذہ اور لائبریری انچارج انہیں کتابیں نہیں دیتے تھے۔ علی اکبر ناطق نے یہ بھی بتایا کہ وہ لاہور میں " فیروز سنز" اور "ماورا" کی کتابیں چوری کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے اور وہ کتابیں پڑھنے کی لگن میں اس حد تک چلے جاتے تھے

پہلی اشاعت:

علی اکبر ناطق کی نظمیں پہلی بار "۲۰۰۹" میں ایک ادبی رسالے میں چھپی۔ علی اکبر ناطق کی دس نظمیں ایک ادبی رسالے جس کا نام " دنیازاد" ہے میں چھپیں۔ اس رسالے کے مدیر " آصف فرخی" ہیں اور یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے۔ یہ چہار ماہی رسالہ ہے اور " ۲۰۰۰ "میں اس کا آغاز ہوا۔ اس رسالے میں "۲۰۰۹" میں پہلی بار ناطق کی دس نظمیں چھپی تو ادبی دنیا میں ناطق کا نام ہر ایک کی زبان پر آ گیا۔ وہ دس نظمیں ناطق کے پہلے مجموعے میں شامل ہیں۔

"۲۰۰۹" میں ہی ایک ادبی رسالہ "آج" نے علی اکبر ناطق کے پانچ افسانے شائع کیے۔ ناطق کے اچھوتے اسلوب اور کہانی کے نئے پن کی وجہ سے ادبی دنیا میں ناطق کو پہلی ہی اشاعت پر کامیابی ملی اور ادب کے بڑے بڑے نام ناطق سے ملے اور اس کو مبارک باد دی۔

پہلا مجموعہ کلام:

علی اکبر ناطق کا پہلا مجموعہ ایک شعری مجموعہ تھا۔ جو "۲۰۱۰" میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا نام " بے یقین بستیوں میں " ہے۔ اس مجموعے میں صرف نظمیں شامل ہیں۔ یہ "آج" کراچی سے چھپا اور اسی مجموعے کو "یوبی ایل" ایوارڈ کے لیے نامزد بھی کیا گیا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔

نثر میں ان کا پہلا مجموعہ " قائم دین" ہے جو ایک افسانوی مجموعہ ہے۔ ناطق کا پہلا افسانوی مجموعہ "۲۰۱۲" میں آکسفورڈ سے چھپا۔ اور اسی مجموعے کو " یوبی ایل" ایوارڈ بھی ملا۔

ملازمت:

علی اکبر ناطق نے بچپن سے ہی محنت مزدوری شروع کر دی تھی۔ بچپن میں جب وہ سکول جاتے تھے تو واپس آکر والد اور بھائیوں کے ساتھ کام کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ یعنی ناطق بچپن سے محنتی تھے۔ ناطق نے پولیس میں ملازمت کے لیے "اے ایس آئی" کی ٹریننگ کی مگر وہ ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے بعد ناطق نے پاک فوج میں " سیکنڈ لیفٹیننٹ " کے

مدرسے کے لیے تیاری اور ٹریننگ میں حصہ لیا مگر مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اسے بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ناطق نے ایک پرائیویٹ کمپنی "[illegible]" میں کئی سال تک ملازمت کی اور وہاں وہ سپروائزر تھے انہوں نے زیادہ عرصہ دیہی علاقوں میں کام کیا۔

"۱۹۹۸" میں ناطق نے پاکستان چھوڑ دیا اور مڈل ایسٹ کا سفر کیا۔ وہ سعودی عرب، عراق، شام اور کویت اور ایران کا سفر کرتے ہوئے رہے اور وہاں محنت مزدوری بھی کرتے رہے۔ معماری کا کام بھی کرتے رہے۔ اور ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کر کے محنت مزدوری کی۔ ناطق نے وہاں پر پیسہ پانے کیلئے لوگوں کے اونٹ چرائے اور پھر دوبارہ معمار ہونے کا کام بھی کرتے رہے۔ وہ "۲۰۰۲" تک وہاں رہے۔ اس کے بعد ناطق پاکستان واپس آ گئے اور انہوں نے یہاں معماری شروع کی اور پھر ٹھیکیداری کا کام کیا۔ کچھ عرصہ اسی کام سے وابستہ رہے۔

اکادمی ادبیات اسلام آباد:

۲۰۰۷ء میں علی اکبر ناطق اکادمی ادبیات سے منسلک ہو گئے۔ وہاں پر کتاب دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے ناطق نے دل جمعی سے کام کیا اور وہاں ایک بک شاپ ترتیب دی اور اس کے انچارج مقرر ہوئے۔ ناطق تین سال تک وہاں ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اور "۲۰۰۹ء" تک اکادمی ادبیات اسلام آباد میں رہے۔

فیڈرل ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن:

۲۰۰۹ء میں ناطق نے فیڈرل ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن میں ملازمت اختیار کی۔ وہاں ناطق نے اپنے فن اور صلاحیتوں کا خوب استعمال کیا اور کچھ سال ملازمت کرنے کے بعد اس ادارے کو بھی خیر آباد کہہ کر چلے گئے۔

مقتدرہ قومی زبان:

علی اکبر ناطق نے کچھ عرصہ مقتدرہ قومی زبان میں ملازمت کر کے ادب کی خدمت کی اور اپنی ادبی و علمی صلاحیتوں کو مزید بڑھایا۔ "۲۰۱۳" تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد یہاں سے دوبارہ "فیڈرل ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن" میں واپس چلے گئے۔

اسوہ کالج اسلام آباد:

۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۶ء تک علی اکبر ناطق نے اسوہ کالج اسلام آباد میں معلم کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد علی اکبر ناطق نے اسلام آباد کو خیر آباد کہا اور لاہور چلے گئے۔

یونیورسٹی آف لاہور:

۲۰۱۶ء میں ناطق لاہور آکر "یونیورسٹی آف لاہور" میں بطور معلم اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ اسی دوران لاہور میں رہتے ہوئے ناطق نے " منہاج یونیورسٹی لاہور" سے "ایم فل اردو" کی ڈگری مکمل کی۔ ۲۰۱۹ میں ناطق " یونیورسٹی آف لاہور" سے الگ ہو گئے اور ملازمت چھوڑ دی۔

مطبوعہ کتب:

علی اکبر ناطق کی مطبوعہ کتب کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ بے یقین بستیوں میں (نظمیں)

۲۔ یاقوت کے ورق (نظمیں)

۳۔ سر منڈل کا راجہ (نظمیں)

۴۔ ریشم بننا کھیل نہیں

۵۔ سبز بستیوں کے غزال (غزلیں)

۶۔ قائم دین (افسانے)

۷۔ شاہ محمد کا ٹانگہ (افسانے)

۸۔ نو لکھی کوٹھی (ناول)

۹۔ هئیت شعر (تنقید)

۱۰۔ فقیر بستی میں تھا (مرقع آزاد)

غیر مطبوعہ کتب:

۱۔ درِ عدالتِ علی (قصیدہ و منقبت)

۲۔ کوفے کا مسافر (ناول)

علی اکبر ناطق کا شمار عصری ادب کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے اور کلاسیکی روایت کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ اردو کی اہم ادبی اصناف میں مصنف مذکور کا کام قابل دید ہے۔ ناطق نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نظم سے کیا۔ علی اکبر ناطق کی ادبی تخلیقات کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

شاعری:۔

شاعری کے حوالے سے علی اکبر ناطق کے چار شعری مجموعے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں ان میں نظموں کے تین مجموعے

ہیں, اور ایک غزل کا مجموعہ ہے۔

ناطق ایک مشاق نظم نگار ہیں۔ ان کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:۔

"علی اکبر ناطق جب نظم کہنے پر آتے ہیں تو ان کی شاعرانہ شخصیت کے مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص بیک وقت دو اتنے مختلف اسالیب اور شخصیتوں کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے؟"(۱)

۱۔ بے یقین بستیوں میں

یہ ناطق کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ "شمس الرحمن فاروقی" نے لکھا ہے۔ اس مجموعے میں کل "۴۳" نظمیں شامل ہیں۔

۲۔ یاقوت کے ورق

یہ ناطق کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ " دست ہنر اور دیدہ بینا" کے نام سے "فہمیدہ ریاض" نے لکھا۔ اس مجموعے میں کل "۳۶" نظمیں شامل ہیں۔

۳۔ سر منڈل کا راجہ

یہ ناطق کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس کا دیباچہ "زیف سید" نے لکھا۔ اس میں کل "۳۳" نظمیں ہیں۔ ناطق کی شاعری میں جدید اور قدیم دونوں طرح کے الفاظ ملتے ہیں۔ اس حوالے سے افتخار عارف لکھتے ہیں:۔

"علی اکبر ناطق کی ایک بڑی خوبی اس کے لفظوں میں استعمال ہونے والے حرفوں اور لفظوں کے اندر مخفی رعایتوں کی بڑی بڑی کہانیاں ہیں، جنہیں اگر کھولیں تو ہزار سال سے تاریخ میں پیدا ہونے والے واقعات کی گھتیوں سے لے کر ثقافتوں کے قفل ابجد ہیں، کھولتے جایئے اور زمانے دیکھتے جایئے۔"(۲)

ریشم بننا کھیل نہیں

بعد ازاں ناطق کی نظموں کے تینوں مجموعے ایک ہی جلد میں " ریشم بُننا کھیل نہیں " کے نام سے شائع ہوئے۔ جسے سانجھ پبلیکیشنز لاہور نے ۲۰۱۹ میں شائع کیا۔ اس کتاب میں نظم کے تینوں مجموعوں کے دیباچے بھی ایک ساتھ شائع کیے

گئے ہیں۔ جن میں سے ایک دیباچہ فہمیدہ ریاض نے لکھا۔ فہمیدہ ریاض ناطق کی شاعری کی جدت اور خاص اسلوب کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"واہ" دل نے کہا تھا۔ "یہ کوئی علی اکبر ناطق ہیں۔ کیسی اور بجنل، ایک سچی تپش رکھنے والی آواز! بہت دنوں بعد ایسی نظمیں پڑھنے کو ملیں۔" بعد میں ایک دو رسالوں میں اس کی کہانیاں بھی پڑھیں۔ ان کا اپنا اک نرالا رنگ ، اچھوتا روپ! مبارک باشد اردو ادب!"(۳)

سبز بستیوں کے غزال:

ناطق اپنی شاعری کے حوالے سے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"میں شعر نہیں کہتا جب تک میرے پاس مسئلہ نہ ہو۔ اور مسئلہ بیان نہیں کرتا جب تک وہ شعر نہ بنے۔ میری نظر میں شعر کے معنی فطرت کی تصویریں ہیں جن کے نقش بولتے ہوں، رنگ حرکت کرتے ہوں، پھر ان سے لمس اور ذائقے جنم لیتے ہوں"(۴)

ایک غزلیات کا مجموعہ " سبز بستیوں کے غزال" بھی ہے۔ جسے سانجھ پبلیکیشنز نے "۲۰۱۸" میں چھاپا۔ اس کا انتساب "شمس الرحمن فاروقی" کے نام ہے۔ اس مجموعے میں کل "۵۲" غزلیں شامل ہیں۔ اور آخر میں "ارسلان راٹھور" کا مضمون "شعر کہے تو چاند بنائے، بات کرے تو پھول" کے نام سے شامل ہے۔ یہ کتاب " ۹۶ "صفحات پر مشتمل ہے۔

ارسلان راٹھور علی اکبر ناطق کے فن شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اگر ناطق نے پرانی دلی کی چوڑی اینٹوں والی گلیوں میں چل چل کر پاپوش نہ گھسائے ہوتے تو شائد ایسا نہ بولتا اور پھڑکتا شعر مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ لیجئے بات چل نکلی تو واقعہ بھی سن لیں، ناطق جب دلی سدھارے تو وہاں کے دوستوں سے مہرولی کے صدیوں پرانے آموں کے ان گھنے باغوں کا سراغ پوچھتے پھرے جن کے نشان یہ پہلے سے آزاد ، فرحت اللہ بیگ، ناصر نذیر فراق ، اشرف صبوحی اور حیرت دہلوی کی تحریروں میں پا چکے تھے، دلی کے دوستوں نے تو اپنی لاعلمی کا عذر کیا لیکن ناطق صاحب اپنی

دھن کے پکے ٹھہرے، پورا دن پا بہ شوق مہرولی کی قرن دیدہ گلیوں میں گھومتے
پھرے، آخر مہرولی سے پانچ سات میل پرے کھنڈرات کے پہلو میں مطلب بر آری
ہوئی،دلی کے یار بھی حیران ٹھہرے۔"(۵)

فکشن نگاری:۔

فکشن کے حوالے سے علی اکبر ناطق کے افسانوں کے دو مجموعے ایک ناول اور ایک سوانحی ناول شائع ہو چکے ہیں اور ادبی دنیا میں پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ناول" نولکھی کوٹھی" جو مصنف مذکور کی سب سے اہم تصنیف سمجھی گئی ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ان کے اس ناول کے اب تک سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔بعد ازاں ایک سوانحی ناول" فقیر بستی میں تھا" گو کہ مصف کی اب تک کی آخری کتاب ہے لیکن اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں،معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول بھی اردو ادب میں اہم اضافہ ثابت ہو گا۔ ناطق کی نثر کو ادبی دنیا میں خاص مقام حاصل ہے۔ان کی کتابیں درج ذیل ہے۔

۱۔ قائم دین(افسانے)

۲۔شاہ محمد کا ٹانگہ (افسانے)

۳۔نولکھی کوٹھی(ناول)

۴۔ فقیر بستی میں تھا(سوانحی ناول)

قائم دین

علی اکبر ناطق کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے "۲۰۱۰" میں آکسفورڈ نے چھاپا۔ اس کے بعد یہ مجموعہ "۲۰۱۸" میں سانجھ پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔اس مجموعے کا انتساب "افتخار عارف" کے نام ہے۔اس میں کل "۱۵" افسانے ہیں اور یہ کتاب "۱۲۸" صفحات پر مشتمل ہے۔

شاہ محمد کا ٹانگہ

یہ دوسرا افسانوی مجموعہ "۲۰۱۰ء" میں سانجھ پبلیکیشنز نے شائع کیا۔ اس مجموعے کا انتساب "یہ گلزار" "شیخن" کے نام ہے۔ اس کتاب میں کل "۱۴" افسانے ہیں۔ اور یہ کتاب "۱۵۲" صفحات پر مشتمل ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے ناطق کی ایک کتاب کا دیباچہ بھی لکھا۔ جس میں وہ ناطق کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "علی اکبر ناطق کو ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے مگر انہوں نے تقریبا سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی ہے۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے افسانے پنجاب کی زمین اور تہذیب سے غیر معمولی دلچسپی اور ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر افسانہ نگار کی نثر، مکالمہ، اور بیانیہ کے نامانوس گوشوں پر بھی ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا ہر صفحے پر خود انسان اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش کے نکات سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔"(۲)

علی اکبر ناطق کے ہاں نظم و نثر میں پنجابی ثقافت اور جدید الفاظ کا عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہ پنجاب کی ثقافت کو عمدگی سے بیان کرتے ہیں اور ان کے افسانوں میں بھی پنجاب کی معاشرتی زندگی، زبان و بیان اور زندگی نظر آتی ہے۔ ان کے ناول میں بھی پنجاب کی ثقافت، رہن سہن، بود و باش کو مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔

فقیر بستی میں تھا

علی اکبر ناطق نے "محمد حسین آزاد" کا مرقع لکھا جس کا نام "فقیر بستی میں تھا" ہے۔ علی اکبر ناطق نے ایم فل اردو منہاج یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا اور ان کا مقالہ محمد حسین آزاد پر تھا اور اسی مقالے میں رد و بدل کر کے ناطق نے اپنی تخلیقی مہارت سے ایک مرقع کی شکل میں شائع کرایا جسے "فقیر بستی میں تھا" کا نام دیا۔ فقیر بستی میں تھا "۲۰۱۹" میں عکس پبلیکیشنز لاہور نے چھاپا۔ یہ کتاب ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ کے بعد اس کتاب کو ۴۵ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر عنوان میں آزادی زندگی کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں مصادر و مراجع بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کا انتساب "آغا سلمان باقر" کے نام ہے۔ اس ضمن میں شہناز نقوی لکھتی ہیں۔

> "کتاب کا سرورق دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ کتنے زمانوں کی گرد، کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی ہو گی۔ اس کتاب میں موجود شخصیت مولانا محمد حسین آزاد اور اس شخصیت کے ایک عاشق علی اکبر ناطق نے براون اور زرد رنگ، کہیں کہیں سرمئی بدلیاں ساتھ ساتھ اجڑتی بستی زندگیاں کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو مسلسل پڑھتی

گئی ،وقت کا خیال ہی نہیں رہا ۔ایک ہی sitting میں ختم کر لی۔ اور پھر مزید کچھ صفحے دوبارہ پڑھے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی seasons دیکھ رہی ہوں،عمدہ طرز بیان کو پڑھنے والا بھی مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ خود کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ کتاب کا اسلوب اتنا پر کشش ہے کہ قاری کو کہیں بھی بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا ورنہ تحقیقی کتب پڑھنا ذرا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔"(۷)

نولکھی کوٹھی

علی اکبر ناطق کا یہ ناول "۲۰۱۴" میں سانجھ پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول کا انتساب " محمد بشیر " کے نام ہے جو علی اکبر ناطق کے والد ہیں۔ یہ ناول "۴۳۲" صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ناطق کو بطور ناول نگار بہت شہرت حاصل ہوئی اور ان کے فن کو سراہتے ہوئے منہاس رقم طراز ہیں:۔

"علی اکبر ناطق۔۔ حیران کر دینے والا شاعر اور کہانی کار تو تھا ہی لیکن اب ناول نگاری کی دُنیا کو نیا رُخ دینے بھی آپہنچا ہے۔ لگتا ہے یہ نوجوان لٹریچر کا کوئی کچھ بھی چھوڑنے کو تیار نہیں اور دل و دماغ کے گھوڑے کو وسیع میدانوں میں سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ تاریخ، ادب اور سیاسیات میں قائم لگے بندھے تصورات کو چیلنج کرنے کے نتیجے میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے لگتا ہے کہ ایک نیا بیانیہ تخلیق ہونے جا رہا ہے۔"(۸)

تنقید نگاری:۔

تنقید کے میدان میں بھی علی اکبر ناطق پیچھے نہیں ہے اور ایک کتاب "ہیئت شعر" کی بازگشت بھی تنقید کے ایوانوں میں گونج رہی ہے۔ اقبالؒ کے فن پر یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے۔ علی اکبر ناطق نے اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب لکھی جس کا نام "ہیئت شعر" ہے۔ اس کتاب میں ناطق نے شعر اقبال کی جمالیاتی ساخت اور فکری نظام پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب "۲۰۱۶" میں اسوۃ کالج اسلام آباد نے چھاپی۔ اس کتاب کو "۹" حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ کتاب "۲۲۴" صفحات پر مشتمل ہے۔

ناصر عباس نیّر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک سطح پر اُن کی تنقید، اس تحقیقی طریق کار کی وضاحت محسوس ہوتی ہے، جسے اُن کی نظم اور فکشن میں برتا گیا ہے، دوسری سطح پر اقبال کی شاعری کا فنی مطالعہ ایک نئی سطح پر کرتی ہے، اور اقبال کی شاعری کو آئیڈیالوجیائی بیانیوں سے آزاد کراتی محسوس ہوتی ہے، تیسری سطح پر جدید شاعری کی تحسین و تفہیم کا پیانہ مہیا کرتی ہے۔"(۹)

انڈیپنڈنٹ اردو:۔[Independent urdu]

علی اکبر ناطق نے ایک ویب سائٹ "انڈیپنڈنٹ اردو" پر "میری کہانی" کے نام سے کہانیاں لکھیں۔ اس میں اپنی زندگی کے حالات وواقعات بیان کیے۔ ان کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ ان کی کہانیوں کی کثیر تعداد اس ویب سائیٹ پر موجود ہے، جس میں ان کے بچپن کے واقعات، جوانی کے قصے، تعلیم سرگرمیاں، ملازمت کی روداد، سفر نامے، غیر ملکی سفر کے تزکرے بچپن کے واقعات اور دیگر کئی امور شامل ہیں۔ ناطق نے اپنی زندگی کی کہانیاں بیان کی ہیں۔

۱۔ شاہیا پہلوان: زمیں کھا گئی پہلواں کیسے کیسے

۲۔ بینڈ پروفیسر اور باراتی گدھا

۳۔ عجائب گھر کے ڈھانچے کا بگ بینگ

۴۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو شاعر کی بجائے چور ہوتے

۵۔ جاٹوں کا مفت گڑ اور دل بے رحم

۶۔ عربی گدھے، کھجوریں اور میں

۷۔ جب لوگ ہماری لاش ڈھونڈنے نکلے

۸۔ جب ہم پھنسے گلیڈی ایٹروں کے چنگل میں

۹۔ جب ہم نے ننگ دھڑنگ بارات نکالی

۱۰۔ جب میاں صاحب نے گورکن پر سانپ سے حملہ کیا

۱۱۔ جب میرا کورٹ مارشل ہوتے ہوتے بچا

۱۲۔ جب اچھو نے پدم ناگ سے مقابلہ کیا

۱۳۔ جب بکرا باباجی کا کشتہ کھا گیا

۱۴۔ جب دادا جی ہمارے تیروں کا نشانہ بنے

۱۵۔ بھارت میں ہم پر کیا بیتی

۱۶۔ جب ہم کشمیر فتح کرتے کرتے بچے

۱۷۔ جب ہم بھیڑیوں کی خوراک بنتے بنتے بچے

۱۸۔ جب ہم طوائف محلے میں گھیر لیے گئے

۱۹۔ کوفہ میں زمانوں کا مسافر

۲۰۔ مراثی کا مرغا اور حج کا ثواب

۲۱۔ نجام الدین کی بستی اور پیسوں کا تھلہ

۲۲۔ ابن بطوطہ امریکہ کو روانہ

۲۳۔ ہائے حاتم طائی کی ہفت سیر رہ گئی

۲۴۔ مجھے قتل ہونا پسند نہیں اس لیے پاکستان نہیں آتا: بھٹو جونیئر

۲۵۔ باباجی کے بھوت

۲۶۔ ملک شرافت خاں کے بھیڑیے اور اماں صالحہ

۲۷۔ ایک الف لیلوی سانپ اور بابا محندہ

۲۸۔ قصہ ہماری سائیکل چوری ہونے کا

۲۹۔ ایسے ٹوٹ کے برسے اولے، پشتیں ہو گئیں لال

یہ تمام کہانیاں " انڈیپنڈنٹ اردو" پر موجود ہیں۔ اس میں ناطق کا انداز بیاں عمدہ ہے اور وہ زندگی کے کسی واقعے کو کہانی بنا دیتے ہیں۔ جیسے پڑھنے والا کوئی افسانہ یا کہانی پڑھ رہا ہو۔ ان تمام کہانیوں میں ناطق کی زندگی کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ کچھ بچپن کے واقعات، اور کچھ جوانی کے۔ اس سے ناطق کی زندگی کے واقعات ان کے عادات و خصائل اور رہن

سہن کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ناطق نے کچھ کہانیاں امریکہ کی بیان کی ہیں جن میں امریکی معاشرت اور رہن سہن کا بیان بھی ساتھ ساتھ ہے۔ انڈیا جاتے ہوئے ناطق کے ساتھ جو واقعات پیش آئے اسے بھی ایک کہانی کے میں بیان کیا ہے جس سے انڈیا کی سماجی زندگی کے پہلو اور وہاں کے لوگوں کے رویے بھی ہمیں اس کہانی میں نظر آتے ہیں۔ ایک اور کہانی "شاہیا پہلوان، زمیں کھا گئی پہلواں کیسے کیسے" میں علی اکبر ناطق نے لاہور کے اس علاقے کی مکمل تصویر بنائی ہے جو اپنی الگ ثقافت اور رہن سہن کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ اور پاکستان کی پنجابی فلم انڈسٹری کی تاریخ اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ تلخ سچائیاں جو فلم انڈسٹری کا حصہ ہیں، بیان کی ہیں۔ شاہیے پہلوان کے بیٹے سے ناطق کی گفتگو اور اس کے نتیجے میں معلوم ہونے والی کہانی ناطق نے بڑے سلیقے سے بیان کی ہے۔ کہانی کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

> "مگر کب تک؟ آہستہ آہستہ اباجی کی علاقے پر حکومت کمزور پڑتی گئی۔ ساہوکاروں اور منڈی والیوں نے چھوٹے چھوٹے بدمعاش خود پالنے شروع کر دیے۔ اس طرح ٹیکس کی رقم کم ہو گئی لیکن قسمیں بنوانا نہ چھوڑیں۔ اس سے یہ ہوا کہ ہماری پہلے اپنی جمع پونجی ختم ہوئی، پھر جگہ بکنے لگی۔ یہ جو تم چھوٹا سا احاطہ دیکھتے ہو، یہ اس سے دس گنا بڑا تھا۔ سارا ایک گیا، کچھ فلموں کے اداکار لے گئے، کچھ پولیس اور عدالت کے دلال لے گئے۔ ہمارے اپنے پٹھے مخالفوں کے مخبر بن گئے۔ جب پیسہ ختم ہو گیا تو اس کے بعد نہ یہاں کوئی فلمی ڈائریکٹر آیا، نہ اداکار کی شکل نظر آئی، نہ کسی رنڈی پھیرا پایا۔"(۱۰)

ایک اور کہانی میں عرب کی سماجی زندگی، معاشرت، مزدور طبقہ، لین دین کے طریقے پر روشنی ڈالی جس میں ناطق نے عرب کے ایک دیہاتی علاقے میں اپنے شب و روز کی داستان بیان کی۔ علی اکبر ناطق کی یہ تمام کہانیاں صرف ادبی حوالے سے قابل تعریف نہیں بلکہ ان کہانیوں میں دوسری بے شمار ثقافتوں اور سماجی نظام کی جھلک واضح دیکھی جا سکتی ہے جو کہ تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی ایک کہانی "جب میرا کورٹ مارشل ہوتے ہوتے بچا" میں انہوں نے علامتی انداز میں کچھ باتیں بھی کی ہیں جن کا تعلق سیاست سے ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ہر کہانی اپنے اندر کوئی نہ کوئی تاریخی، ادبی، ثقافتی، سماجی پہلو لیے ہوئے ہے۔ ان کی تمام کہانیاں ادبی حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مذہبی نکتہ نظر:

علی اکبر ناطق کے افسانوں، ناول اور شاعری میں مذہب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے مذہبی عقائد پر ڈٹ جانے والے انسان ہیں۔ ان کی نجی زندگی ہو یا معاشرتی زندگی وہ مذہب کو بنیادی اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مذہبی رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ عام طور پر غزل میں اس طرح کے موضوعات برتنا مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ناطق کی غزل میں مذہبی عنصر پایا جاتا ہے ان کے ہاں متعدد اشعار مذہبی تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ناطق غزل میں مذہبی تلمیحات استعمال کرتے ہیں۔ مذہبی تشبیہات، استعارات اور الفاظ کا استعمال ناطق کی غزل میں ملتا ہے۔

ہم کہ غزالاں شہر اماں کا رستہ پوچھتے پھرتے ہیں
صحن حرم کو روک کے بیٹھے مسجد کے سگ اور بدو لوگ

اس شعر میں ناطق نے مذہبی تناظر میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ ان کی غزلیات میں بے شمار اشعار اسی تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے زیادہ تر اشعار مذہبی پس منظر رکھتے ہیں۔ کہیں مذہب پر طنز ہے تو کہیں مذہب کی تاریخ، کہیں کسی مذہبی واقعے کا ذکر۔ گو غزل میں ناطق کا مذہبی نقطہ نظر واضح طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

کافر غم نے آیت و زم زم، سب کچھ سے انکار کیا
ہم نے پڑھا جب شعر فسوں تو آنکھ سے چشمہ پھوٹا ہے

اس شعر میں مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور تاریخی مذہبی واقعات کا ذکر کر کے اسے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ آب زم زم کا چشمہ پھوٹنا اور اس کا اثر، ناطق نے اپنے شعری انداز میں اس کو خوبصورتی سے پیش کیا۔

ناطق کی غزل کے علاوہ نظم میں بھی مذہبی عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی نظم " جو طور سینا سے لوٹ آئے "
"عظیم مدفن" عصا بیچنے والو" "سفیر لیلیٰ" "کلیسا" "مدینے کا قصہ" "سلام" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ناطق کے افسانوں میں بھی مذہبی افسانے ملتے ہیں جن میں مذہب پر اور مولویوں پر طنز نظر آتا ہے۔ ان کا افسانہ
" کمی بھائی" مذہبی نقطہ نظر سے ایک اہم افسانہ ہے جس میں ہمارے معاشرے اور مذہب کا ایک رنگ دکھایا گیا ہے۔
اس کے علاوہ "مولوی کی کرامت" افسانے میں ناطق نے مذہبی پیشواؤں کو نشانہ بناتے ہوئے ان پر طنز کیا ہے۔
"تابوت" "والٹر کا دوست" "زیارت کا کمرہ" اور "حاجی ابراھیم" علی اکبر ناطق کے وہ افسانے ہیں جن میں مذہب کو
کسی نہ کسی طرح موضوع بنایا گیا ہے۔ علی اکبر ناطق کے مطابق مولوی اور دینی پیشوا مذاہب کا غلط استعمال کر کے عوام کو
گمراہ کرتے ہیں۔ یہ تمام طبقہ مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ان کا فسانہ "معمار کے ہاتھ" اسی کی ایک
مثال ہے۔

سیاسی نقطہ نظر:

علی اکبر ناطق کا ملکی و غیر ملکی سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ ان کے بہت سارے افسانے سیاسی پس منظر میں لکھے
گئے ہیں۔ ان کا اکلوتا ناول "نولکھی کوٹھی" بھی سیاسی تریخ پر لکھا گیا ہے۔ ناطق نے اپنی شاعری میں بھی سیاست کو
موضوع بنایا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں سیاسی مفہوم رکھتی ہیں۔ ان کی غزل میں بھی سیاست کا رنگ نظر آتا ہے جو کہ عام
طور کسی شاعر کے ہاں کم کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاعری کی روایت میں نظم میں سیاسی موضوع پائے جاتے ہیں مگر غزل کی
تاریخ میں یہ شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے کہ کوئی شاعر اپنے شعر میں سیاسی موضوع اپنائے۔ ناطق کی نظم میں بھی سیاست کو
موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو نظم کی روایت میں "سیاست" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے نظم گو شاعر اپنے دور
کے سیاسی اتار چڑھاؤ کو اپنی نظم کا موضوع بنا چکے ہیں۔ جیسے "مارشل لاء" پر بہت سی نظمیں لکھی گئیں جمہوریت،
آمریت کو نظم میں جگہ دی گئی۔ علی اکبر ناطق کے ہاں بھی نظم میں ملکی و غیر ملکی سیاست کا موضوع ملتا ہے۔ ایک شاعر
چونکہ حساس ہوتا ہے اس کا سماج پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ ناطق نے چونکہ
پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان، امریکہ، کا سفر کیا ہے اور کافی عرصہ وہاں گزرا ہے۔ عراق، ایران، کویت اور سعودیہ

میں ناصح کی زندگی کے کئی سال گزرے ہیں اس لیے ناصح کو تحریک و طیر کی سیاست سے واسطہ رہا ہے۔ ناصح سیاسی منظر نامے سے خوب واقف ہیں اس بات کی شہادت ان کی نظموں میں ملتی ہے۔ ان کی نظمیں "غلام قوم کا دانشور" "ہجرت" "نام ونسب" "شہر کا ماتم" "لیلاس" "اور "سفیر بخت" وغیرہ کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم "نام ونسب" ملاحظہ ہو:

اے مرا نام ونسب پوچھنے والے سن لے
مرے اجداد کی قبروں کے پرانے کتبے
جن کی تحریر مہ و سال کے فتنوں کی نقیب
جن کی بوسیدہ سلیں سیم زدہ شور زدہ
اور آسیب زمانے کے رہے جن کا نصیب

پشت در پشت بلا فصل وہ اجداد مرے
اپنے آقاؤں کی منشا تھی مشیت ان کی
گر وہ زندہ تھے تو زندوں میں وہ شامل کب تھے
اور مرنے پہ فقط بوجھ تھی میت ان کی
جن کو مکتب سے لگاؤ تھا نہ مقتل کی خبر
جو نہ ظالم تھے نہ ظالم کے مقابل آئے
جن کی مسند پہ نظر تھی نہ ہی زنداں کا سفر
اے مرا نام ونسب پوچھنے والے سن لے
ایسے بے دام غلاموں کی نشانی میں ہوں

(نام ونسب)

اس نظم میں تاریخ کے اوراق کو پر ولتے ہوئے شاعر نے اپنی قوم کی زبوں حالی بیان کی ہے کہ کس طرح اقوام جن کی شان اور جاہ و جلال کے قصے ساری دنیا میں سنائے جاتے تھے مگر کیسے وہ اپنے ہی ہاتھوں زوال کا شکار ہو گئیں۔ وہ قومیں جو اپنا نام و نسب تک زندہ نہ رکھ سکیں ایسی قومیں جو نہ ہی ظالم ہیں کہ اپنا نام برقرار رکھیں نہ ہی وہ مظلوم ہیں کہ ان کو تاریخ میں جگہ ملے۔ اپنے لیے کچھ نہ کر سکنے والی اقوام کسی کام کی نہیں رہتیں۔

راقمہ کے سوال کہ "آپ ادب برائے ادب کے قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کے قائل ہیں" کے جواب میں علی اکبر ناطق کا کہنا تھا کہ:

"یہ تمام باتیں لوگوں کو الجھانے کے لیے کی جاتی رہی ہیں۔ آپ جو بھی بات کرتے ہیں جو بھی ادب تخلیق ہوتا ہے اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ تمام باتیں زندگی کے احاطے میں آتی ہیں۔ انسان کا چارم ہے وہی اس کی زندگی ہے۔ (۱۱)"

ناطق کے خیال میں تمام اصطلاحات گمراہی کا راستہ دکھاتی ہیں جبکہ جس نے جو ادب تخلیق کرنا ہے وہ کرے گا۔

ان کی نظم کے علاوہ ان کے ناول اور ان کے افسانوں میں بھی سیاسی صورتحال کو فکشنائز کیا گیا ہے۔ ناطق ایک ایسا کہانی گو ہے جو نہ صرف علامات کے ذریعے اپنا مدعا بیان کرتا ہے بلکہ اکثر مقامات پر وہ بے باکی سے سب بیان کر جاتا ہے۔ جیسے ان کا افسانہ " معمار کے ہاتھ" "تابوت" "والٹر کا دوست" "سیاہ ٹھپا" اور "تمغہ" وغیرہ میں سیاسی صورتحال کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے یا کسی جگہ سیاست کو مصنف نے بڑی چابکدستی سے افسانے میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانے " والٹر کا دوست " سے ایک اقتباس دیکھیے:

"دو گھنٹے بعد اسلامی تنظیم کے سربراہ سمیت چھ لڑکے ہمارے سامنے ڈی سی صاحب کے کمرے میں مجرموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے انہیں آگے دھکیلتے ہوئے فخریہ مسکرا کر کہا، سر انہیں ڈرامینگ روم کی سیر کروا کے آپ کے پاس لائے ہیں اور لیڈر کے بالوں کو کھینچتے ہوئے بولا۔ سر یہ نواب کا بیٹا مجھے بھی دھمکیاں دیتا تھا۔"(۱۲)

علی اکبر ناطق ملکی سیاست سے بھی مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔ "انڈ یپنڈنٹ اردو" پر ان کی کہانیاں تازہ سیاسی صورتحال کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان کی ایک کہانی جس کا عنوان " مجھے قتل ہونا پسند نہیں اس لیے پاکستان نہیں آتا: جونیئر بھٹو" سے اقتباس دیکھئے؛

> "میں نے پوچھا، آپ پاکستان کیوں نہیں آتے اور پاکستان کی ادھڑی کا ہے کو نہیں بچاتے کہ بھٹو کے اصلی وارث تو آپ ہی ہیں۔،
> بولے۔، ناطق جی، آپ رائیٹر ہیں، کیا نہیں جانتے سیاست مین جنھیں قتل و غارت کی عادت نہیں ہوتی وہ قتل ہو جاتے ہیں؟ مجھے قتل ہونا پسند نہیں اور ایسی حالت میں کہ جب اس کے بدلے میں خلق خدا کا بھلا بھی نہ ہو۔ اب یا تو میں دل و کتاب کا آدمی ہو جاتا یا جنگ و جدل کا۔ مجھے دل کی بستی اچھی لگی اور اس میں چلا آیا۔"(۱۳)

سیاست پر ایک سوال کے جواب میں علی اکبر ناطق نے کہا:

> "بنیادی طور پر انسان قانون سے اہم ہے۔ قانون انسان کے لیے ہوتا ہے انسان قادن کے لیے نہیں۔ قانون خواہ کوئی بھی ہو، جمہوریت یا آمریت کے قوانین میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ یہ قوانین عوام الناس کے لیے دیواریں ہیں، ان کے حقوق ضبط کرنے کے لیے طرح طرح کے قوانین بنائے گئے ہیں جبکہ اشرافیہ کے لیے ان قوانین میں راستے ہیں۔ میں ایک ادب دوست آدمی ہوں ،نہ میں جمہوری ہوں نہ ہی آمر۔ کوئی بھی عوام کے لیے کام کرے، عوام کے مفاد میں ہو تو میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں کبھی بھی نعروں کا حصہ نہیں بنوں گا۔ میرا کوئی لیڈر نہیں ہے میں کسی کو پاکستان میں اپنا لیڈر نہیں مانتا اور نہ کسی سیاسی پارٹی کو مانتا ہوں۔ میں ایک آزاد آدمی ہوں، میں آج تک سرکاری نوکری نہیں کر سکا اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ میرا یہ کام ہے کہ میں معاشرتی اور سماجی سطح پر عوام الناس کو شعور دوں، بحثیت ایک تخلیق کار میں یہی کر رہا ہوں اور یہی میرا کام ہے۔"(۱۴)

علی اکبر ناطق نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ شہرت سمیٹی۔ ان کے بارے میں ہر خاص و عام نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علی اکبر ناطق عصری ادب میں انتہائی اہمیت اختیار کر گئے ہیں اور ان کا کام ادب کی کسی

ایک صنف یا جہت میں نہیں ہے بلکہ ناطق نے نظم، غزل، افسانہ، ناول، مرقع سازی، کالم نگاری اور تنقید کے میدان میں بہت کم وقت میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے نقاد اور ادیب ناطق کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ اور ان کے فن کو سراہا گیا ہے۔

ایک ویب سائیٹ "GOOD READERS" پر ناطق کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ:۔

"Ali Akbar Natiq's work is not only remarkable for its shrewd and accurate observations about the Punjab villages and small town society of Pakistan, but also for its intellectual complexity and depth. Read together, these stories about the common people in Pakistani villages paint the most succinct picture of Pakistan's rural culture and are the best sociological study of our rural society in recent times."(۱۵)

ایک سوال، ادب کے سماج پر کیا اثرات ہیں؟ کے جواب میں ناطق کا کہنا تھا کہ:

"سوسائٹی نے ادب سے اثرات لینا چھوڑ دیے ہیں۔ ادب پڑھنا اب لوگوں کا کام نہیں رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاشرہ اس حد تک پہنچ چکا ہے۔ ذہنی طور پر یہ شفاف معاشرہ نہیں ہے۔ کروڑوں کی آبادی میں صرف چند ہزار لوگوں کا ادب سے تعلق رہ گیا ہے۔"(۱۶)

علی اکبر ناطق نے ادب اور سماج کے تعلق کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ بات واضح کی کہ ادب کا اثر معاشرے پر اس وقت ہو گا جب اس معاشرے میں ادب پڑھنے والے لوگ موجود ہوں گے۔ جب کہ آج کل انٹرنیٹ اور مشینی دور ہے اور لوگ ادب سے دور ہو گئے ہیں۔

علی اکبر ناطق کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن اس قدر پختہ اور سچا کیوں ہے۔ ناطق نے زندگی کے نشیب و فراز میں اپنے فن کو جاندار انداز سے تجربات کی روشنی میں سینچا اور وہ ہر صنف سخن میں کامیاب ہوئے کیونکہ ان کے اندر کا تخلیق کار مصنوعی نہیں بلکہ خالص ہے۔ علی اکبر ناطق سے جب راقمہ نے یہ سوال کیا کہ کیا ایک تخلیق کار زندگی کے تلخ تجربات سے گزر کر ہی اچھا فن پارہ تخلیق کر سکتا ہے؟ کوئی آسودہ زندگی گزارنے والا بغیر تلخی محسوس کیے اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتا؟ اس کے جواب میں علی اکبر ناطق نے کہا کہ:

"تخلیق کار کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود تمام تجربات کرے یا تلخ زندگی گزار کر ہی اچھا لکھے۔ اگر ایک تخلیق کار خالص ہے اور اس کے اندر کچھ تخلیق کرنے کا ہنر ہے تو اس کی زندگی جیسی بھی ہو وہ اچھا ادب تخلیق کرے گا۔ اس کے لیے ذاتی تجربات کا ہونا ضروری نہیں۔"(۱۷)

علی اکبر ناطق نے راقمہ کے ایک سوال؛ کہ آج کا ادب کلاسیکی ادب کے مقابلے کہاں کھڑا ہے؟ جواب دیا:

"کلاسیک کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پرانی ہو۔ ہر وہ ادب کلاسک ہے جو بہترین ہو۔ کلاسک کی تعریف یہ نہیں ہے کہ وہ پرانا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اچھا لکھا گیا ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج کل بھی بہترین ادب لکھا جا رہا ہے۔ اور قدیم کچرا لکھا گیا کبھی بھی کلاسیک میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ادب اس وقت اچھا لکھا گیا وہ آج تک کلاسیک ہے اور جو آج اچھا لکھا جا رہا ہے وہ بھی کلاسیک ہی ہے۔ بے شک آج بھی بہترین ادب لکھا جا رہا ہے مگر پڑھنے والوں کی کمی ہے۔ لوگ اس خوشی سے اور لگن سے نہیں پڑھتے جیسے پہلے دور میں پڑھنے والے تھے کیونکہ اب انٹرٹیمنٹ کے زیادہ ذرائع آگئے ہیں۔"(۱۸)

خاتمہ:

علی اکبر ناطق ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جو اپنی زندگی کے کمی کو تاہیوں اور تلخیوں کو اپنے فن میں ڈھال کر اس کا "کتھارسس" کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیق زندگی سے قریب ترین محسوس ہوتی ہے، خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ ناطق نے بہت کم عرصے میں بہت زیادہ مقبولیت سمیٹی اور ملکی و غیر ملکی سطح پر معروف ترین تخلیق کار بن گئے، دس سال کے عرصے میں "نو" کتب تخلیق کیں اور نظم و نثر ہر صنف سخن کو آزمایا اور کامیاب ہوئے۔

ناطق کے پہلے ہی افسانوی مجموعے کو "یو بی ایل" ایوارڈ ملا۔ یہ کسی بھی تخلیق کار کی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اس کی پہلی ہی کاوش کو اتنا سراہا جائے۔

ملکی و غیر ملکی بڑے اخباروں میں ناطق پر مضامین چھپ چکے ہیں۔ کہیں ان کی نظم و غزل پر بڑے بڑے نقادوں نے مضامین اور کالمز لکھے تو کہیں ان کے افسانے اور ناول پر بڑے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اردو افسانے کا ایک اہم نام، اردو کے معروف افسانہ نگار

"افکار حسین" نے بھی ناطق پر ایک مضمون لکھا جو ایک معروف اخبار میں چھپا۔ "شمس الرحمن فاروقی" صاحب نے بھی ناطق پر مضامین لکھے اور ناطق کی ایک کتاب کا دیباچہ بھی لکھا۔ فاروقی صاحب کی بیٹی نے بھی علی اکبر ناطق پر ایک کالم لکھا جس میں ناطق کو اردو کا بڑا تخلیق کار بتایا۔ اس کے علاوہ دیگر بے شمار لوگوں نے ناطق پر اخبار اور رسائل و جرائد میں مضامین لکھے۔

"گرانٹا" جیسے بڑے ادارے سے ناطق کے افسانوی مجموعے کا ترجمہ بھی ہوا۔ ان کے ناول "نولکھی کوٹھی" کا بھی ترجمہ ہوا۔

"پینگوئن" سے ناطق کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی زبانوں میں ناطق کے افسانے اور ناول کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

ناطق بیرون ملک میں بھی اتنے ہی معروف ہیں جتنے وہ پاکستان میں ہیں۔ دنیا کے جس جس کونے میں ادب دوست لوگ موجود ہیں وہاں ناطق کا تذکرہ پہنچ چکا ہے۔

ناطق انڈیا میں کئی ادبی پروگراموں کی صدارت کر چکے ہیں۔ جن میں "ریختہ" کے پروگرام بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جموں کشمیر میں "فیض میلہ" میں شرکت کر چکے ہیں۔ اور "غالب انسٹیٹیوٹ پروگرام" میں بھی ناطق نے اپنی فنی صلاحیتیں دکھائیں۔

"سارک کانفرنس" امریکہ میں ناطق نے بطور "چیف گیسٹ" شرکت کر چکے ہیں۔

وسکانسن یونیورسٹی" میں ناطق نے ادب پر لیکچر دیے اور پاکستان کی نمائندگی کی۔ ناطق نے وہاں افسانے پر بات کی۔ اور اس کے علاوہ زبان و بیان اور اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔

"نیویارک" یونیورسٹی میں بھی ناطق نے دو پروگراموں میں شرکت کی اور وہاں "اردو شاعری" پر بات کی۔

ناطق نے امریکہ، انڈیا اور دیگر ممالک میں مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں بھی شرکت کی۔ علی اکبر ناطق دورِ حاضر کے ایک معروف و مشہور ادیب ہیں۔ جنہوں نے ہر دو اصناف میں اپنی مہارت دکھائی۔

حوالہ جات:

۱۔ فاروقی، شمس الرحمن(۲۰۱۹) دیباچہ، "ریشم بننا کھیل نہیں"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۳

۲۔ عارف، افتخار (۲۰۱۸) دیباچہ، "سبز بستیوں کے غزال"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۹

۳۔ ریاض، فہمیدہ، (۲۰۱۹) پیش لفظ، "ریشم بننا کھیل نہیں"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۵

۴۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۳) پیش لفظ، "یاقوت کے ورق"، کراچی، آج پبلیکیشنز، ص ۷

۵۔ راٹھور، ارسلان (۲۰۱۸) مضمون، "سبز بستیوں کے غزال"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۸۹

۶۔ فاروقی، شمس الرحمن(۲۰۱۹) دیباچہ، "ریشم بننا کھیل نہیں"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۳

۷۔ نقوی، شہناز، (۲۶ جون ۲۰۱۹) pm۱۲، مضمون، علی اکبر ناطق،
&id=۲۰۹۰۸۹۵۵۰۷۸۷۰۳۰۸https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=
۱۶۴۵۰۶۰۴۱۹۱۲۰۴۸۸

۸۔ منہاس، امجد سلیم (۲۰۱۹) "نو لکھی کوٹھی"، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص (بیک فلیپ)

۹۔ نیّر، ناصر عباس (۲۰۱۶) "ہیئت شعر"، اسلام آباد، اسوہ کالج، ص (بیک فلیپ)

۱۰۔ ناطق، علی اکبر (۱۲ فروری ۲۰۲۰) am۲، شاہیا پہلوان، انڈپینڈنٹ اردو

۱۱۔ علی اکبر ناطق، مصاحبہ، بمقام پنجاب سوسائٹی، لاہور، ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۹

۱۲۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۲۲

۱۳۔ ناطق، علی اکبر (۱۲ فروری ۲۰۲۰) am۲، مجھے قتل ہونا پسند نہیں؛ جونئیر بھٹو، انڈپینڈنٹ اردو

باب دوم:

ناطق کی شاعرانہ جہت

علی اکبر ناطق کی نظم:

علی اکبر ناطق نے شاعری کا آغاز نظم سے کیا۔ شاعری کے حوالے سے علی اکبر ناطق کے چار شعری مجموعے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں جن میں ایک غزل کا اور تین نظموں کے مجموعے شامل ہیں:

۱۔ بے یقین بستیوں میں

یہ ناطق کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ "شمس الرحمن فاروقی" نے لکھا ہے۔ اس مجموعے میں کل "۴۳" نظمیں شامل ہیں۔

۲۔ یاقوت کے ورق

یہ ناطق کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ "دست ہنر اور دیدہ بینا" کے نام سے "فہمیدہ ریاض" نے لکھا۔ اس مجموعے میں کل "۳۱" نظمیں شامل ہیں۔

۳۔ سر منڈل کا راجہ

یہ ناطق کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس کا دیباچہ "ذِیف سید" نے لکھا۔ اس میں کل "۳۳" نظمیں ہیں۔

بعد ازاں یہ تینوں مجموعے ایک ہی جلد میں "ریشم بننا کھیل نہیں" کے نام سے شائع ہوئے۔ جسے سانجھ پبلیکیشنز لاہور نے ۲۰۱۹ میں شائع کیا۔

سبز بستیوں کے غزال:

علاوہ ازیں ایک غزلیات کا مجموعہ "سبز بستیوں کے غزال" بھی ہے۔ جسے سانجھ پبلیکیشنز نے "۲۰۱۸" میں چھاپا۔ اس کا انتساب "شمس الرحمن فاروقی" کے نام ہے۔ اس مجموعے میں کل "۵۲" غزلیں شامل ہیں۔ اور آخر میں "ارسلان راٹھور" کا مضمون "شعر کہے تو چاند بنائے، بات کرے تو پھول" کے نام سے شامل ہے۔ یہ کتاب "۹۹" صفحات پر مشتمل ہے۔

ناطق ایک مشاق غزل گو اور باریک بین نظم نگار ہیں۔ ناطق کی نظم کا معیار متعین کرنے سے پہلے اردو نظم اور اس کی روایت پر روشنی ڈالیں گے جس سے ناطق کی نظم کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

اردو نظم کی روایت۔

نظم کو وسیع معنی و مفہوم کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نثر کا الٹ یعنی شاعری کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ یعنی جو چیز نثر نہیں ہے اور منظوم ہے وہ نظم کہلاتی ہے۔ مگر شاعری میں نظم باقاعدہ ایک صنف سخن ہے۔ نظم کے لغوی معنی "لڑی میں پرونا" ہیں۔ نظم کوئی ایک موضوع رکھتی ہے اس لئے اس کا کوئی عنوان ہوتا ہے۔ نظم میں یہ خصوصیت بھی ضروری ہے کہ اس کے تمام اشعار میں ربط ہو۔ تاکہ موضوع کی یکسانیت برقرار رہے۔ کولرج کے ہاں "بائیو گرافیا لٹریریا" میں نظم کی تعریف ایسے ملتی ہے:

> "اگر ایک حقیقی نظم کی تعریف درکار ہے تو میرا جواب یہ ہو گا کہ وہ نظم لازمی طور پر ایسی ہو جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو باہمی طور پر آگے بڑھا رہا ہو۔ اور ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کر رہا ہو اور سارے حصے اپنے تناسب کے اعتبار سے ہم آہنگ ہوں"(۱)

مشرقی نقاد شمس الرحمن فاروقی نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نظم کی آسان اور جامع تعریف یہ ہے کہ ہر وہ منظوم کلام جو غزل نہ ہو، نظم ہے"(۲)

نظم کو اکائی قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "نظم کے پیکر کی خصوصیت اس کی اکائی ہوتی ہے۔ اور نظم کا ہر مصرع اپنی مجرد حیثیت سے محروم محض ایک مرکزی خیال کی تعبیر میں صرف ہوتا ہے۔"(۳)

اخترالایمان نے بھی "اکائی" اور وحدت کو ہی نظم کی خصوصیت کہا ہے:

ہر نظم بذات خود ایک وحدت ہوتی ہے۔ جس طرح کسی وحدت میں ایک ایک جز کی کوئی حیثیت نہیں، ٹھیک اسی طرح نظم کا ایک شعر اپنی جگہ پر علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ تمام مصرعے مل کر اس کو ایک مکمل شکل میں جنم دیتے ہیں، گویا نظم کی وحدت کے لئے یہ لازمی ہے۔" (۱۴)

جمال گوہر کوپوری نے نظم کی تعریف یوں اس طرح کی:

"نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہے جس میں پابندی ہو وہ سلسلہ ہو اور ابتدا ہو اور ہر بند اس طرح کی میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول معلوم نہ ہو۔۔۔ نظم کے پہلے مصرعے سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے جیسے ایک پھیلی ہوئی چیز کو کھولا جا رہا ہے۔ بغیر پابندی اور ربط کے نظم نظم نہیں ہے۔" (۱۵)

نظم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نظم کا آغاز دکن سے ہوا تھا۔ دکنی دور میں نظم کے ابتدائی نمونے وافر ملتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نظم کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس سلسلے میں حضرت گیسو دراز کے والد سید یوسف حسینی شاہ راجو کی "تحفۃ النصائح" کو پہلی نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد قلی قطب شاہ اور دیگر شعراء نے رنگارنگ موضوعاتی نظمیں لکھیں۔ اگر ہم شمالی ہند میں دیکھیں تو جعفر زٹلی کے ہاں اور افضل جھنجھانوی کے ہاں ہمیں ابتدائی نظم کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔ دکن میں شاعری کو مذہب کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور شاعری سے مذہبی تبلیغ مقصود تھی تو اس وجہ سے نظم کو غزل کی نسبت زیادہ اہمیت دی گئی۔

اردو نظم کی تاریخ کے حوالے سے سب سے اہم نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ نظیر کے ہاں ہمیں صحیح معنوں میں مرتبہ "نظم" دیکھنے کو ملتی ہے۔ نظیر نے باقاعدہ و جدید نظم لکھنے کا آغاز کیا۔ نظیر اکبر آبادی نے اردو نظم میں وہ مضامین متعارف کرائے جو براہ راست عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ نظیر نے عوامی مسائل کو نظم میں بیان کیا۔ نظم میں نہ صرف عوامی مسائل کو موضوع بنایا بلکہ معاشرے کی تبلیغ کا کام بھی کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں برسات، ہولی، مفلسی، شب برات، بنجارہ نامہ، روٹی، عوامی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتی نظمیں ہیں جو موضوعات کے حوالے سے اہم تو ہیں ہی مگر نظیر کی ابتدائی نظمیں ہونے کے باوجود نظیر کو باقاعدہ نظم کا شاعر تسلیم کرواتی ہیں۔ نظیر اردو نظم کے پیش رو کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو نظم کا موضوع بنایا خواہ وہ عشق، مذہب، تہوار، اخلاق، سیاست، دین، مسائل ہوں، بھوک افلاس ہو یا پھر سیاست۔ اس عہد کی دکنی معاشرت ہمیں نظیر کی نظموں میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔

غدر کے بعد ہندوستان کے سیاسی معاشی معاشرتی حالات میں بہت زیادہ تبدیلی آئی۔ جس کا اثر اردو شاعری اور خاص طور پر نظم پر پڑا۔ اس تاریخی موڑ کے بعد ہندوستانیوں کے خون میں انقلاب پروری موجزن ہو گئی۔ اس کے بعد اردو نظم کے موضوعات میں زبردست تبدیلی آئی اور اس کی وجہ ۱۸۵۷ کی جنگ تھی۔ اس کے بعد آنے والے نظم گو شاعر خواہ وہ 'حالی' ہوں سرسید ہوں اکبر یا اقبال کوئی بھی اس اثر سے بچ نہ سکا۔ سرسید نے باقاعدہ "عقلیت پسندی" کی تحریک چلائی۔ اور ان کو مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حالی اور آزاد نے بھی "نیچرل شاعری" کی تحریک کا آغاز کیا اور ادب کو قومی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے لیے "جدید نظم نگاری" کی شروعات کی۔ ۱۸۵۷ کی جنگ کے اثرات جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں پر پڑے وہاں ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ حامد کاشمیری لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی میں مغربی نظموں کے بعض نمونوں کے زیر اثر اردو میں نیا ماحول فروغ پانے لگا، بہ ہر حال، مروجہ اصناف میں کسی خارجی موضوع پر نظم لکھنے کا سلسلہ آزاد و حالی تک جاری رہا، بل کہ ان کے بعد اس وقت تک جاری رہا، جب تک نظم آزاد اور نظم معریٰ کے نمونے اردو میں متعارف کیے گئے، یہ نظمیں بالعموم خارجی نوعیت کی ہیں اور کسی بھی خارجی موضوع مثلاً فطرت، شہری زندگی، عمارات و باغات یا عصری حالات وغیرہ کو نظمانے کے عمل کی پابند ہیں۔"(۶)

اسی کے ساتھ ہی ایسا طبقہ موجود تھا جو مغربی طرز فکر کے خلاف تھا۔ جن میں نظیر اکبر آبادی شامل ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ حالی اور ان کے رفقاء نے اردو نظم کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجمے ہوئے اور اردو نظم کیلئے نئے راستے کھلے۔ پرانے نئے لوگ اس روایت کو لے کر آگے بڑھتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔ حالی، آزاد، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خاں، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، اکبر، شرر اور اقبال اہم نام ہیں۔ یہ تمام لوگ جدید

شاعری کے پیش رو ہیں اور 'نیچرل شاعری' کے حامی ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے حالی کے تصور کو تراش کر ایک نئی تعریف پیش کی:

"جن میں کوئی خیال بہت سادگی سے بندھ گیا ہے یا جن میں سوز و گداز، جوش دل یا حسن دل فریب کی سچی تصویریں نظر آتی ہیں، نیچرل شاعری ہے۔" (۷)

حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں وزن کو "نفس شعر" کیلئے ضروری قرار نہیں دیا۔ شرر نے اردو نظم کی ہیئتی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ اور آزاد نظم کے ابتدائی نمونے متعارف کرائے۔ اس کے علاوہ "انجمن پنجاب" نے اردو نظم کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ اور نظم اپنی ہیئتی اور اسلوبیاتی تبدیلی کا راستہ طے کرتی ہوئی بیسویں صدی تک "جدید اردو نظم" کی شکل اختیار کر گئی۔ احسان دانش، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، نے جدید نظم کو عروج پر پہنچایا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسند تحریک نے اردو ادب پر اثر ڈالا اور ادب کا راستہ بدل گیا۔ فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، مطلبی فرید آبادی، کیفی اعظمی، مجاز، جاںنثار اختر، احمد ندیم قاسمی اس تحریک سے وابستہ اہم نظم گو شعراء ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک اور تحریک "حلقہ ارباب ذوق" سے وابستہ شعراء بھی نظم کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جن میں اردو نظم کے دو بڑے نام ن۔م۔راشد اور میراجی شامل ہیں جنہوں نے اردو نظم کا دامن موتیوں سے بھر دیا۔ اس کے علاوہ کچھ شعراء جنہوں نے جدید نظم کو آگے بڑھایا ان میں، مجید امجد، منیر نیازی، ابن انشاء، جعفر طاہر، سید ضمیر جعفری، وزیر آغا، ساقی فاروقی وغیرہ شامل ہیں۔ اخترالایمان نے اپنے الگ رنگ سے نظم کو آراستہ کیا۔ حبیب جالب عوامی شاعر کے طور پر سامنے آئے۔

اردو ادب کی ایک اور تحریک "نئی شاعری" کے نام سے سامنے آئی اور شاعروں کا ایک ایسا گروہ جنہوں نے نظم میں لسانی تشکیلات پر کام کیا ان میں انیس ناگی، جیلانی کامران، افتخار جالب، عباس اطہر اور سلیم الرحمن قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں جو نظم گو سامنے آئے ان میں ابرار احمد، ذیشان ساحل، نصیر احمد نصیر، انوار فطرت، رفیق سندیلوی، اظہر غوری، عبدالرشید، جاوید انور شامل ہیں۔

شاعرات جنہوں نے جدید نظم کو بلندیوں پر پہنچادیاان میں پروین شاکر، نسرین انجم بھٹی، سارا شگفتہ، فہمیدہ ریاض، ثمینہ راجا، یاسمین حمید، کشور ناہید، حمیدہ شاہین اور منصورہ احمد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو نظم میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں اور تجربات دیکھنے میں آئے اور وہ اپنا سفر کرتی ہوئی آج اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ جدید شاعری میں سب سے زیادہ مقبول صنف سخن خیال کی جاتی ہے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید نظم کا ایک معتبر نام علی اکبر ناطق ہیں۔ جنہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی نظم سے کیااور اردوادب کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ کرتے ہوئے نظم کے تین مجموعے اردو نظم کو عطا کیے۔

علی اکبر ناطق کی نظم کا فکری وفنی جائزہ:۔

علی اکبر ناطق کی نظم پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایسا شاعر ہے جو لفظوں پر مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید مضامین کو بھی قلم کی نوک پر رکھتا ہے۔ ناطق کی نظم میں مابعد الطبیعاتی رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ ناطق نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا اور پابند نظم اور نظم معراء میں برابر اپنے تخلیقی جوہر دکھائے۔ایک کے بعد ایک نظم کا مجموعہ منظر عام پر آیااور ناطق کے قلم سے اردو نظم کے دامن میں نئے رنگ نسل کے پھول کھلتے گئے۔ناطق کے ہاں نظم میں بے شمار نئے مضامین ملتے ہیں جو اس سے پہلے ایسے نہیں برتے گئے تھے یا پھر برتے ہی نہیں گئے تھے۔پرانے مضامین کو بھی ناطق نے اپنے طرز تحریر سے اجالا ہے۔ناطق کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی نظم پر کوئی ایک طرح کی چھاپ نہیں لگنے دی۔ حالانکہ ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جدت مضامین، منفرد اسلوب، اور ندرت خیال کو ناطق نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ہر نظم ایک الگ پہلو رکھتی ہے۔زبان و بیان ہو یا فکری بحث،ناطق نے اپنا ایک الگ انداز ڈھونڈا ہے۔ان کی نظموں میں یکسانیت نظر نہیں آتی۔ کہیں وہ پنجاب کے میلے ٹھیلوں،مقامی زبان و معاشرت کا ذکر اس انداز سے کرتے نظر آتے ہیں کہ گویا اس مٹی سے نظمیں گوندتے ہیں۔جب کہ دوسری طرف وہی ناطق عرب ثقافت کو اپنی نظموں کا ایسے حصہ بناتا ہے کہ کوئی اہل عرب بھی بیان نہ کر سکے۔ان کی نظموں میں بیک وقت زندگی کی رنگینیاں اور فطرت میں جو نوع انسانی کے لئے سکون موجود ہے اس کا سراغ ملتا ہے وہیں زندگی کی بے ثباتی اور بے رحمی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اور ہر نظم کو پڑھتے

ہوئے انسان اسی نظم میں جینے لگتا ہے گویا زندگی یہی ہے۔ مگر اگلی نظم میں مختلف مزاج ملتے ہی ساری توجہ اسی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ کسی بھی لکھاری کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کی وہ قاری کو اپنی تحریر کے سحر میں مبتلا کر دے۔ ناطق کی نظم کے بارے میں کچھ نقاد اور ادبی لوگ منفی رائے رکھتے ہیں۔ مشہور کالم نویس "ظفر اقبال" نے ایک کالم "علی اکبر ناطق کی شاعری اور خانہ پری" کے نام سے لکھا:

"علی اکبر ناطق افسانہ نگار، ناول نگار شاعر اور نقاد تو ہیں ہی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کل کلاں مجسمہ ساز، مصور اور مفتی بھی نکل آئیں۔"(۸)

ناطق نے چونکہ اپنا ادبی سفر بہت جلدی طے کیا ہے اور بہت کم وقت میں ان کی شاعری اور نثر کی" ۹ "کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس لیے بعض نقاد اور ادیب اس بات سے خائف نظر آتے ہیں۔ ظفر اقبال نے بھی ناطق کی نظموں کو " خانہ پری" کہا ہے کہ ناطق ہر صنف ادب میں مجموعے لانے کی غرض سے لکھتا ہے۔ اور ان کے کلام میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔ انہوں نے ناطق کی نظم پہ طنز کرتے ہوئے ایک نظم بھی اپنے کالم میں پیش کی۔ مگر جہاں ناطق کے خلاف لکھنے والے موجود ہیں وہیں ان کے فن کو سراہنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ناطق کی نظم کی تعریف کی ہے اور انہوں نے ناطق کو نظم کا بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ان کی نظم کے مابعد الطبیعیاتی سروکار میراجی کی یاد دلاتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ کوئی جدید شاعر ایسا نہیں ہے جس نے میراجی کو اس طرح جذب کر لیا ہو۔ متاثر ہونا اور بات ہے، لیکن مزاج کے اختلاط کا میل بالکل دوسری بات ہے۔ اور نادر بات ہے۔"(۹)

شمس الرحمن فاروقی نے ناطق کو میراجی کے پائے کا شاعر کہا ہے۔ انہوں نے ناطق کی اپنی پنجابی سرزمین سے محبت اور اس کو شاعری میں برتنے کو بھی سراہا ہے۔ ناطق کی نظم میں مابعد الطبیعیاتی پہلو پر روشنی ڈالی۔ ان کو جدید نظم کا شاعر قرار دیا۔ ناطق نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میں شعر نہیں کہتا جب تک میرے پاس مسئلہ نہ ہو۔ اور مسئلہ بیان نہیں کرتا جب تک وہ شعر نہ بنے۔ میری نظر میں شعر کے معنی فطرت کی تصویریں ہیں جن

> کے نقش بولتے ہوں، رنگ حرکت کرتے ہوں، پھر ان سے لمس اور ذائقے جنم لیتے ہوں۔ میں شاعری میں لفظی ڈرامہ بازی کو مطعون سمجھتا ہوں جس میں قاری پر فقط رعب گانٹھنا مقصود ہو۔ شاعر سادہ دل، سادہ لوح اور صاف گو ہوتا ہے۔ اس کا کام لفظوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے نہ کہ ان کو رسوا کرنا۔"(۱۰)

ناطق کی نظم میں پنجاب کی مٹی سے لے کر عرب کی ریت تک تمام موضوعات زیر بحث ہیں۔ ناطق نے اپنی نظم میں ہر اس چیز کو موضوع بنایاہے جوان کی زندگی کے تجربات ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کو اس خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری اس سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کی پہلی کتاب کی پہلی نظم "ریشم بننا کھیل نہیں" اس حوالے سے نہایت خوبصورت نظم ہے جس میں زندگی کی تلخ حقیقت بیان کی گئی ہے۔

ہم کو خبر ہے ان کاموں میں جان کا زیاں ہو جاتا ہے

لیکن فطرت کی مجبوری ہم ریشم کے کیڑوں کی

سچا ریشم بنتے ہیں اور تار لپٹتے جاتے ہیں

آخر گھٹ کر مر جاتے ہیں ریشم کی دیواروں میں

کوئی ریشم بن کر دیکھے ریشم بننا کھیل نہیں

(ریشم بننا کھیل نہیں)

اس طرح ان کی اک اور نظم "ہڈیوں کے دفینے" میں بھی اسی قسم کی تاریخ ملتی ہے ہے۔ جو نظام سالہا سال سے چل رہا ہے۔ اور قدرت کے سامنے انسان بے بس نظر آتا ہے۔ ان قدرت کے ہاتھوں مجبور ہے اور موت کی سفاکیت کے آگے بے بس۔ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

ڈھیر بڑھتے گئے، ہڈیوں کی فصلیں کھڑی ہو گئیں

در میاں ان کے آہستہ آہستہ میں ٹوٹنے لگا

اور تیشہ مرے اک طرف خامشی سے

نئے گڑھے کھودنے والے کا منتظر ہے

وہ کہتا تھا میں نے کوئی خواب دیکھا

(ہڈیوں کے دفینے)

اس کے علاوہ ان کی نظم "اٹھیں گے موت سے پہلے" "نام و نسب" "عظیم مدفن" "صدیوں کا غریب" "چرواہے کا جواب" "فن کا مصور" "یہ باتیں اب راز رہیں گی" "فنا کی لاش" "ابد کی سانسیں" "کانچ کا شہر" "جب ہم دریا پار کریں گے" اس سلسلے میں دیکھی جا سکتی ہیں ان نظموں میں زندگی کی بے ثباتی اور موت کے دکھ کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی نظم میں پنجاب کا رنگ نظر آتا ہے۔انہوں نے بہت مقامات پر پنجابی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو اردو نظم میں مستعمل نہیں تھے۔ان کی بہت سی نظموں میں پنجاب کی ثقافت اور وسطی پنجاب کی معاشرت دیکھی جا سکتی ہے۔چونکہ ان کا کہنا ہے کہ وہ ایسے شاعر ہیں جو اپنے تجربے کو شاعری میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں اور کبھی اس موضوع پر نہیں لکھتے جو انہوں نے خود دیکھا یا محسوس نہ کیا ہو۔وہ وسطی پنجاب کے باسی ہیں اس لیے ان کی شاعری میں پنجاب کی خوشبو ہے۔ان کی نظم ملاحظہ ہو:

دریا کے اس پار کھڑا ہے پیپل کا جو نیلا پیڑ

جس کی رگوں سے دودھیا چانن کرنیں بن کر چھنتا ہے

پتے کھڑ کھڑ کرتے ہیں تو درد کا باجا بجتا ہے

چاروں اور سے پیلی سرسوں چھم چھم ناچنے لگتی ہے

(نیلا پیپل میرے گیت)

اس نظم میں پنجاب کا نقشہ کھینچتے ہوئے ناطق نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ درخت، پانی، کھیت
کھلیان ہر چیز کو ناطق نے اپنی نظموں میں خاص جگہ دی ہے۔ ان کی ایک اور نظم دیکھیے

کچا گاؤں وہی گلیاں کچے آنگن نیم کے سائے

ٹھنڈی مٹی بہتی ندیاں کالے ساون نیم کے سائے

اڑتے پنچھی ڈوبتا سورج شام کی سرخی پھول گلابی

چرتی بھیڑیں پیلے سبزے پھولی سرسوں نیم کے سائے

(نیم کے سائے)

اس نظم میں گاؤں کی خوبصورتی بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ بھی بے شمار نظموں میں گاؤں کی تہذیب و معاشرت نظر آتی
ہے۔ جن میں "سونے کا پیڑ" "قصبے کا سٹیشن" "پرانا قصہ" "چودی گلی کے سامنے" "میلا مانکسو" "سفید کبوتر پالنے والے" "شریر بابو"
"زیتونوں کا باغ" وغیرہ شامل ہیں۔

ناطق نے نہ صرف وسطی پنجاب کی معاشرت کو اپنی نظم کا حصہ بنایا ہے بلکہ اس نے جہاں جہاں بھی کچھ عرصہ قیام کیا وہاں
کی زندگی اور تجربات کو اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنے فن پاروں کا حصہ بنایا۔ ان کی بعض نظموں میں عربی
معاشرت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ جیسے کہ ان کی نظم "بادرا چھوکرا" ملاحظہ ہو:

وہ گاؤں گاؤں پھر گیا گلہریوں سے گفتگو کے شوق میں

بہار آفرین سبز سبز پانیوں کے درمیاں سیاہ رنگ بیریوں کے باغ میں

وہ دیکھتا شریر طوطیوں کو نیلگوں مزاج نرم نرم کونپلوں سے کھیلتے ہوئے

گلاب اور کاسنی شراب جیسی تتلیوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے غول کو اڑا کے بھاگتا تھا

آسماں کی بدلیوں کے ساتھ ساتھ

(بادر اچھوکرا)

عرب ممالک میں ناطق نے اپنی جوانی کے بہت سے سال گزارے اس لیے ناطق کے ہاں بے شمار نظموں میں عرب کی بودوباش اوروہاں کی زندگی کے مسائل زیر بحث رہے ہیں۔ان کی تاریخ سے ناطق خوب واقف ہیں ان کے عروج و زوال کے قصے ناطق نے اپنے قلم کی فنکاری سے بیان کیے ہیں۔ناطق کی مشہور نظم "سفیر لیلیٰ" بھی اسی تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے اوراس حوالے سے سب سے زیادہ نظمیں ان کے دوسرے مجموعے "یاقوت کے ورق" میں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔عرب معاشرت کے حوالے سے ان کی نظموں میں مجد، عرب ،صحرا، ریت وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔جن میں عصا بیچنے والو" مضاف دریا" سفیر لیلیٰ" فقط ستون ہیں" دیدبان" مدینے کا قصہ" ریت کے ٹیلے" کریموں کا سلطان" زیتون کے باغ" پرانے گنبد" صنوبر سا آدمی" دریاؤں کے پار"جو طور سینا سے لوٹ آئے" شامل ہیں۔ان کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

ایک اداس کلیسا جس کو گھور لیا اندھیاروں نے

کوئی حواری آگ جلانے اب نہ یہاں پر آئے گا

مریم گود میں نور لیے پھر کس کا رستہ دیکھتی ہے

(کلیسا)

ناطق اپنی شاعری کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک میری شاعری کو فطرت اور تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھا جائے گا تب تک آپ اس شاعری سے صحیح طریقے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔وہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی شاعر تب تک شاعر نہیں بنتا جب تک وہ اپنی فطرت کے قریب نہ ہو۔انہوں نے ریختہ اور دوسری ادبی ویب سائٹس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں اپنی فطرت کے قریب ہوں اور ہر موضوع کو پہلے اپنے

اندر پکاتا ہوں اس کے بعد اسے تخلیق کی شکل میں سامنے لاتا ہوں۔ اسی طرح ان کی شہرہ آفاق نظم "سفیر لیلیٰ" کے بارے میں بھی انہوں نے یہی کہا کہ عرب میں جہاں میری نظروں کے سامنے کئی ایسے منظر اور واقعات گزرے اور تاریخ کو میں نے قریب سے دیکھا اور جذب کیا۔ اور کئی عرصے تک یہ نظم میرے اندر پکتی رہی اس کے بعد اس کو نظم کی صورت میں پیش کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نظم ایک پوری کہانی ہے یا پورا افسانہ ہے۔ اس نظم کے چار حصے ہیں۔ اور ان کی اس نظم کو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں پزیرائی ملی ہے۔ اس نظم کو سمجھنے کے لئے تہذیب اور تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی لیے ناطق کا کہنا ہے کہ میری شاعری کو تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی تفہیم ہو سکے گی۔ اس نظم میں پوری کی پوری عرب تہذیب ثقافت اور تاریخ کو عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی نظم "سفیر لیلیٰ" کے بارے میں زیف سید لکھتے ہیں:

"علی اکبر ناطق کی لگ بھگ ہر نظم سننے کے بعد جب بھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شائد اس نے اپنے اظہار کی معراج حاصل کر لی ہے۔ اور اس سے آگے بڑھنا نا ممکن ہو گا، وہ اگلی ہی نظم میں ایک نیا راستہ اختیار کر کے نئے سفر پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال کے لئے :یاقوت کے ورق: میں شامل "سفیر لیلیٰ" دیکھئے جو اپنی اٹھان کے لحاظ سے زمانہ قبل از اسلام کے سبع معلقات کی یاد دلاتی ہے۔"(۱۱)

ان کی نظم "سفیر لیلیٰ" ملاحظہ ہو:

سفیر لیلیٰ یہی کھنڈر ہیں جہاں سے آغاز داستاں ہے

ذرا سا بیٹھو تو میں سناؤں

فصیل قریہ کے سرخ پتھر اور ان پہ اژدر نشاں برجیں گواہ قریہ کی عظمتوں کی

چہار جانب نخیل طوبیٰ اور ان میں بہتے فراواں چشمے

بلند پیڑوں کے جھنڈ سے سامنے تھے، شاخ زیتون اسی جگہ تھی

یہی ستون تھے جو دیکھتے ہو پڑے ہیں مردہ گدھوں کی مانند

اٹھائے رکھتے تھے ان کے شانے عظیم قصروں کی سنگیں سقفیں

یہی وہ در ہیں سفیر لیلیٰ کہ جن کے تختے اڑا دیے ہیں

(سفیر لیلیٰ ۱)

یہ ان کی نظم سفیر لیلیٰ کا پہلا حصہ ہے جس میں وہ کھنڈروں سے تاریخی عمارات اور شان و شوکت کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ تمام جاہ و جلال اب مٹی میں دب گیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ ماضی کے ان ایام میں لے جاتے ہیں جب ہر طرف ہریالی اور خوشحالی تھی۔ عظمتوں کے دن تھے مگر اب صرف بربادی اور کھنڈر ہیں۔ ان کی نظم تاریخی اعتبار بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی نظم کے دوسرے حصے سے کچھ اشعار دیکھتے ہیں:

ہجوم طفلاں تھا یا تماشے تھے بوزنوں کے

کہ کوئی دیوار و در نہ چھوڑا

وہ ان پہ چڑھ کر شریف چہروں کی گردنوں کو پھلانگتے تھے

دراز قامت، لحیم، بونے

رضائے باہم سے کولھوؤں میں جتے ہوئے تھے

خراستے تھے وہ زرد غلہ تو اس کے پسنے سے خون بہتا تھا پتھروں سے

مگر نہ آنکھیں کہ دیکھ پائیں نہ ان کی ناکیں کہ سونگھتے وہ

فقط وہ بیلوں کی چکیاں تھیں سروں سے خالی

قریب تھا کہ تھے لوگ چپ چاپ تھے اور بند ہیں کھڑکیاں گھروں کی
سفیر لیلیٰ یہ داستاں ہے اسی کھنڈر کی
(سفیر لیلیٰ)

ناطق نے نہ صرف بربادی کا بیان کیا ہے بلکہ اس نظم میں اس بربادی کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ وہ تمام فعل جو بربادی کا پیش خیمہ تھے مگر دیکھنے والوں نے ان سے ایسے منہ پھیرا ہوا تھا جیسے وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اسی کا نتیجہ وہ تمام شان و شوکت اور زندگی کے رنگ کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔ یہ نظم ایک کہانی کی طرح ہے۔ اس کے تیسرے حصے پر نظر ڈالتے ہیں

سفیر لیلیٰ تمہارا ناقہ!

میں اس کے مرنے پہ غم زدہ ہوں

تمہارے رنج و الم سے واقف، بڑے خساروں کو دیکھتا ہوں

سو آؤ اس کی تلافی کر دوں، یہ میرے شانے ہیں بیٹھ جاؤ

تمہیں خرابے کی کارگہہ سے نکال آؤں

دیار لیلیٰ کو جانے والی حفیظ راہوں پہ چھوڑ آؤں

(سفیر لیلیٰ)

اس نظم کا ہر حصہ دوسرے حصے کی ایک کڑی ہے۔ جس طرح ایک کہانی آگے بڑھتی ہے اور آہستہ آہستہ قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ قاری آگے کی کہانی جاننے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس نظم کو پڑھتے ہوئے اس کے اگلے حصے کی طرف دھیان جاتا ہے کہ کہانی میں آگے کیا ہوگا۔ اور اس کے چار حصے پڑھ کر ہی بات مکمل سمجھ آتی ہے۔ نظم میں کہانی کو اس مہارت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس

میں تخلیق کار کی محنت اور نظم نگاری پر عبور اور الفاظ استعمال کرنے کا سلیقہ دیدنی ہے۔ جو کہ جدید نظم نگاروں کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔اس نظم کا چوتھا اور آخری حصہ ملاحظہ ہو:

سو اب نہ ناقہ، نہ کوئی نامہ، نہ لے کے آیا جواب نامہ

میں نامراد و خجل مسافر

مگر تمہارا امین قاصد عزا کی وادی سے لوٹ آیا

اور اس نجیب و کریم محرم، وفا کے پیکر کو دیکھ آیا

جو آنے والے دنوں کی گھڑیاں ابد کی سانسوں سے گن رہا ہے

(سفیر لیلیٰ ۴)

اس چوتھے حصے کی تکمیل کے ساتھ ہی اس نظم کی کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ان کی اس نظم کو ادبی حلقوں میں بہت پزیرائی ملی ہے بلکہ بعض نقادوں کے بقول ناطق کے پاس سفیر لیلیٰ نظم ہے جو نظم کہلاتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی نظمیں بس نام کی اور بھرتی کی نظمیں ہیں۔مگر اس کے ساتھ ہی بڑے ادبی ناموں نے ناطق کی نظموں کو سراہا ہے۔اردو نظم کی بڑی شاعرہ فہمیدہ ریاض ناطق کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"وہ عربی زبان سے واقف ہے اور عربی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔اس نے قدیم عربی شاعری "سبع معلقات" کو پڑھا ہے۔اس سفر اور مطالعے نے اس کے طرز اظہار میں تازہ خون داخل کیا ہے۔عربی شاعری نے اس کی نظموں میں صحرا کے استعارے دیے ہیں اور اس کے تخیل کو اساطیری رنگ بخشا ہے۔"(۱۲)

ناطق کی نظم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناطق نے نظم میں بے شمار نئے پرانے مضامین برتے ہیں۔اس نے بعض جگہ اجتہاد سے کام لیا ہے۔اسے روایت شکن بھی کہا جا سکتا ہے۔نقادوں

اور اہل ادب کی رائے ناطق کے بارے میں مل چکی ہے۔ ناطق کو جہاں اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ پذیرائی ملی وہیں ان کو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ لیکن کسی بھی بڑے نکھار کیلئے یہ تمام سفر ضروری ہے۔ ناطق کی نظم پر بے شمار اعتراضات اٹھائے جاسکتے ہیں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناطق کی بعض نظمیں فن کی معراج کو چھو رہی ہیں اور ناطق نے یکے بعد دیگرے نظم کے دامن میں تین مجموعے دان کیے ہیں۔ جن کا ذکر نظم کی تاریخ میں اس وقت تک رہے گا جب تک نظم رہے گی۔ شاعری اور خاص طور پر نظم کے بارے میں علامہ اعجاز فرخ رقمطراز ہیں:

> "کسی بھی شاعر کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی شاعری کا کتنا حصہ عالمی ادب کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہے۔ اس کے پیش نظر اردو کے کئی شعراء صف اول میں شمار کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ نہیں طے کیا جا سکتا کہ ان میں بڑا شاعر کون ہے۔ اس ضمن میں صرف تخیل کی بلندی ہی واحد معیار نہیں، بلکہ خیال کا تعمق، اس کی گہرائی، خیال کو محسوس بنا دینے کی صلاحیت، موضوع کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ جذبہ کی جس آنچ میں شاعر تپ رہا ہے، اسکی تپش کو دوسرے تک پہنچانے کی قدرت، لفظ کو معنی کے نئے پیراہن عطا کرنے کی اہلیت، مانوس خیال کی۔ تہہ میں جدت اور انوکھے خیال کو مانوس کر دینے کی استطاعت سبھی کچھ شامل ہیں۔"(۱۳)

خاتمہ:

علی اکبر ناطق جب نظم کہتا ہے تو وہ اس میں مکمل زندگی بیان کرتا ہے۔ ناطق کی نظموں میں زندگی کا ہر رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ناطق کبھی فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو کبھی معاشرے کے بھدے اصولوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے، کبھی وہ مذہبی روایات کو اپنی نظم کا حصہ بناتا ہے۔ کبھی

پنجاب کی ثقافت کو یوں کاغذوں لکھ دیتا ہے تو کبھی عرب کے ریگستانوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا ہے اور کبھی ہندوستان کی سماجی زندگی کی جھلک دکھلاتا ہے۔ ناطق کی نظم اپنے اندر ایک نہیں بلکہ بہت ساری ثقافتیں لیے ہوئے ہے۔ ایک جدید نظم کا ایک اہم شاعر ہے جس نے ادب کے باب میں اپنی نظموں کے خزانے وان کیے ہیں۔

علی اکبر ناطق کی غزل

سبز بستیوں کے غزال

اردو غزل کی مختصر روایت:

اردو میں غزل وہ صنف ہے جس کو اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ابتداء سے ہی اس کی آبرو برقرار ہے۔ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں غزل نے سفر کیا۔ اردو غزل کی ابتداء فارسی سے ہوتی ہے۔

اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں غزل کی تعریف یوں بیان ہوئی ہے :

"اسم مؤنث (عربی) لغوی معنی عورتوں کے ساتھ بات چیت اور عشق بازی۔ (شاعری) وہ صنف سخن جس میں عموماً حسن و عشق وصال و فراق، شراب وشباب، یاس و حرماں اور تصوف و معرفت وغیرہ کی باتیں کہی جائیں۔ لیکن غزل اس حد بندی کی پابند نہیں رہی۔ اب اس میں ہر قسم کے ماضوعات و مسائل نظم کیے جاتے ہیں۔ غزل ہر بحر میں کہی جاتی ہے۔ اس کا ہر شعر عموماً جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی اشعار کے مصرع ثانی میں قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہو، مقطع کہلاتا ہے۔ سب سے عمدہ شعر کو شاہ بیت کہتے ہیں۔"(۱۴)

عرب میں قصیدہ عام زمانہ قدیم سے عام رہا۔ عرب شعراء قصیدے کے شروع میں محبوب کی تعریف کرتے تھے۔ اسلام پھیلنے کے ساتھ ثقافت بھی دور تک پہنچی اور قصیدہ ایران پہنچا اسی کی کوکھ سے غزل نے جنم لیا۔ اہل فارس نے قصیدے سے تشبیب کو الگ کر کے غزل کے نام سے مستقل صنف سخن بنا لیا۔ فارسی میں غزل کا سہرا قدیم شاعر "رُودکی" کے سر ہے۔ اس نے غزل کو عملی شکل میں پہلی بار برتا اور عشقیہ شاعری کو باقاعدہ غزل کا موضوع بنایا۔ اس کے بعد یہ صنف فارسی ادب کی محبوب صنف سخن بن گئی۔

ایران سے ہندوستان کا سفر کرتے ہوئے غزل اپنی پہچان بنا چکی تھی۔ ہندوستان میں "امیر خسرو" کو اردوغزل کا اولین شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ خسرو کے ساتھ ساتھ دوسرے شعراء نے بھی اردو غزل کو پروان

پروان چڑھی۔ اس میں وجہی، قلی قطب شاہ، حسن شوقی، نصرتی، ہاشمی، بحری، ملکی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو غزل کے ساتھ اردو زبان کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہے۔ ولی کا دیوان جب دلی پہنچا تو اس وقت وہاں فارسی عام تھی۔ شمال ہند میں اردو غزل کی ابتدا تو گیارہویں صدی ہی میں خواجہ مسعود سعد سلمان سے ہو چکی تھی لیکن اس کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں ولی دکنی کی دلی آمد کے ساتھ ہوا۔ ولی کے بعد اساتذہ نے ریختہ کو اہمیت دی اور سراج الدین خان آرزو، شاہ حاتم نے ریختہ کے اصول و فن قائم کیے اور شعر گوئی شروع کی۔ اس دور کی غزل کی اہم خصوصیت ایہام ہے۔ اس کے بعد اردو غزل نئی ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے میر و سودا تک پہنچی۔ یہ دور اردو غزل کا سب سے بہترین دور کہلاتا ہے۔ اور اس دور کی غزل کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو غزل کے اس دور کے خدائے سخن میر تقی میر سب سے بڑے غزل گو قرار پائے۔ میر درد نے غزل کو الگ مقام پر پہنچایا۔ انہوں نے عشق اور تصوف کو غزل کی جھولی میں پروان چڑھایا۔

دلی کے بعد دوسرا مرکز لکھنؤ تھا۔ انشاء، جرات، میر حسن دلی سے لکھنؤ منتقل ہوتے ہیں۔ اسی زمانے میں نظیر اکبر آبادی جو کہ دلی اور لکھنؤ سے دور آگرے میں سخن کے دامن کو موتیوں سے بھر رہا تھا اس نے غزل میں بہترین کلام چھوڑا۔ لیکن ان کی نظم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لکھنؤ کے بعد دوبارہ دلی میں غزل نے اپنا ڈنکا بجایا اور میر سے غالب تک کا سفر غزل کے ارتقاء کا سنہرہ دور ہے۔ غالب، ذوق، مومن، شیفتہ اور ظفر جیسے شعراء نے غزل کا ان مٹ باب رقم کر ڈالا۔

اسی طرح غزل کی آبیاری کا سلسلہ امیر مینائی، داغ، حالی، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے ہوتا ہوا جب اقبال تک پہنچتا ہے تو غزل عصری حسیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔ ان شعراء نے غزل کو حسن و عشق کے علاوہ زندگی کے تمام رنگوں سے رنگ دیا۔ چنانچہ اس دور میں روایت کے اسی انحراف نے اردو غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ اس کے بعد حسرت موہانی اہم نام ہے مگر حسرت سے پہلے شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی، صفی لکھنوی، جلیل مانک پوری، ثاقب لکھنوی، فانی بدایونی، عزیز لکھنوی، اصغر گونڈوی

تاریخی حوالے سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اردو غزل تیزی سے اپنی ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی جدید تر غزل کے دائرے میں داخل ہو گئی۔ عصری اہمیت کے حامل موضوعات کو پذیرائی ملی۔ غزل کی تاریخ میں یہ رویہ روایت کے آس پاس زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اس عہد میں شعر کی انفرادیت اس کا مزاج اسلوب اور فکر وفن کو اہمیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ غزل تحریکوں اور رجحانات سے آزاد ہو کر شاعروں اور شعر گوئی کے دور میں داخل ہو گئی۔ خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

"چوں کہ جدید غزل جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی پیداوار ہے اس لیے اس غزل میں ہمیں ایک نئی فضا اور ایک نیا ذائقہ ملتا ہے۔ غزل میں پرانی علامتوں کی تکرار، گھسے پٹے تلازموں کی بجائے تازہ علامتیں ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔"(۱۵)

غزل میں جدیدیت کے نقوش اصغر، فانی، یگانہ، جگر، شاد، فراق میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کو نئی غزل کا پیش رو کہا جا سکتا ہے ان کے ساتھ اور بعد میں آنے والے شعراء ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، ظفر اقبال، باقر مہدی، ندا فاضلی، ساقی فاروقی پروین شاکر اور افتخار عارف وغیرہ شامل ہیں جن کی بدولت غزل نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ان شعراء نے غزل کو جدید غزل کے تناظر سے ہٹ کر دیکھا اور برتا اور جدید تنقید کی زبان میں اسے مابعد الجدید غزل کہا جاتا ہے۔ ما بعد الجدید غزل میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت کو بھی اہمیت دی گئی ۔ علی اکبر ناطق بھی جدید غزل لکھتے ہیں مگر اس میں کلاسیکی رنگ بھی نمایاں ہے۔

ناطق کی غزل

علی اکبر ناطق کی غزل کی کتاب " سبز بستیوں کے غزال" سانجھ پبلیکیشنز سے "۲۰۱۹" میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں کل "۵۲" غزلیں ہیں۔ اس کتاب کا انتساب "شمس الرحمن فاروقی" کے نام ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں " ارسلان راٹھور" کا مضمون " شعر کہے تو چاند بنائے، بات کرے تو پھول" بھی شامل ہے اور یہ کتاب "۹۶" صفحات پر مشتمل ہے۔

فنی اعتبار سے ناطق کے ہاں کئی زاویوں سے اجتہاد دیکھنے کو ملتا ہے۔ مصرعہ کی صوتیات اور لفظوں کی نشست و برخاست ایک خاص طرح کا آہنگ پیدا کرتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے کلام ناطق کے فکری و فنی پہلو دیکھ لیے جائیں۔ ناطق نے غزل لکھنے سے پہلے نظم لکھی اور یکے بعد دیگرے تین مجموعے نظم کے منظر عام پر آئے۔ اس لیے ان کی غزل پر نظم کا گمان گزرتا ہے۔ وہ خیال ہو یا مصرعے کی بنت اس میں بہر حال نظم کا عکس نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور نثر نگار و نقاد عامر حسینی صاحب جن کا ناطق کے ساتھ براہ راست دوستانہ تعلق ہے۔ ان سے جب ناطق کی غزل کے بارے میں راقمہ نے سوال کیا تو ان کا جواب کچھ یوں تھا:

> "ناطق کے ہاں اوسط غزل نظر آتی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ آپ غزل پڑھ رہے ہیں یا نظم۔ اس کی غزل میں نظم کا رنگ چھایا ہوا ہے اور ناطق کی غزل اچھی غزل کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔"(۱۶)

ناطق کو عام طور پر نظم گو شاعر کیا جاتا ہے اور جب بات ان کی غزل پر آتی ہے تو اس کو بے شمار اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی غزل میں بعض مقامات پر عروضی لاپرواہی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن بعض اشعار نہایت خوبصورتی سے کہے گئے ہیں۔ ناطق نے موجودہ قواعد وضوابط کو نظر انداز کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ حالی کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں غزل کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "اگر اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں۔ یا تازہ کیفیات جن سے اس کا دل روز مرہ کسی واقعہ کو سن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ متکیف ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔"(۱۷)

ناطق کی غزل کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کی غزل وسطی پنجاب کی مٹی سے اگی ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ ان کے اشعا میں پنجاب کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ نہ صرف موضوع میں پنجاب نظر آتا ہے بلکہ ناطق کے ہاں اردو غزل کی روایت سے ہٹ کر پنجابی الفاظ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کو نئے طریقے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ پنجابی الفاظ کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ قاری غزل کو وسطی پنجاب میں محسوس کرتا ہے۔ اردو غزل نے دلی، لکھنؤ اور دکن کا سفر کیا مگر ناطق اردو غزل کو وسطی پنجاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ یقیناً بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ناطق نے پنجابی الفاظ کو اس سلیقے کے ساتھ باندھا ہے کی وہ غزل کی خوبصورتی بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جامنوں والے دیس کے لڑکے، ٹیڑھے ان کے طور

پنکھ ٹٹولیں طوطیوں کے وہ پھر کر ہر ہر ڈال

ابز شیشے بیریوں کے بیریاں پنجاب کی

چکنی شاخوں کی رگوں میں نیلی لہریں آب کی

شیشموں نے چھتریاں کھولیں دنوں کی دھوپ میں

روغنی پتوں نے چھاؤں چھوڑ دی سرد آب کی

ہم نے شہتوت کے باغوں سے چرائی گولیں

فصل سر سبز میں بے بار نہیں رہتے ہیں

ان اشعار میں لفظوں کی موسیقی اور ندرت دیدنی ہے۔ ناطق نے لفظ شیشوں باندھا ہے جو اس کے اسلوب کا حصہ ہے یعنی ناطق کے ہاں ہر لفظ اور معانی کی نئی شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان اشعار میں پنجاب کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ اردو غزل میں پنجابی رنگ اور الفاظ استعمال کرنے پر ناطق پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔ اور بعض نقادوں کے ہاں اسے برا فعل گردانا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کالم نگار ظفر اقبال نے روزنامہ دنیا میں علی اکبر ناطق پر کالم لکھا جس میں انہوں نے ناطق کی شاعری پر طنز کرتے ہوئے ایک نظم بھی لکھی۔ مگر جہاں ناطق کے فن پر اعتراض کرنے والے موجود ہیں وہیں ناطق کے کلام کو سراہنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جدید اردو غزل کے شاعر افتخار عارف ناطق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ناطق کی غزل اپنے قصبے کی دیواروں اور کھیتوں کی سبز مٹی سے جڑی ہے۔ اس کی زبان کا خمیر اپنی دھرتی کی خوشبوؤں سے اٹھا ہے۔ اس کا ایک ایک مصرعہ اس کے اٹوٹ سمبندھ کی گواہی دیتا ہے۔ یہ ہنر آفرین شعری طلسم کسی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ الہامی اور وجدانی تو فیق کی جزا ہے جس نے ناطق کو اپنی شاداب و خوش رنگ پانیوں والی دھرتی سے باندھے رکھا۔"(۱۸)

ناطق موضوع اور ماحول کی مناسبت سے خالص لفظ استعمال کر کے مصرعے میں جان ڈال دیتا ہے۔ ان کی غزل میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا اور لفظ اپنی جگہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ناطق کے بارے میں ایک ویب سائیٹ: گڈ ریڈرز "پر لکھا گیا ہے کہ

"Ali Akbar Natiq's work is not only remarkable for its shrewd and accurate observations about the Punjab villages and small town society of Pakistan, but also for its intellectual complexity and depth. Read together, these stories about the common people in Pakistani villages paint the most succinct picture of

Pakistan's rural culture and are the best sociological study of our rural society in recent times."(۱۹)

ناطق غزل کا لہجہ کر جان بوجھ کر مشکل الفاظ استعمال کرنے کی بجائے جدید اور آسان الفاظ سے شعر کے اثر کو بڑھانا ناطق کا خاصا ہے۔ ناطق کی غزل میں فطرت کی سی روانی ہے۔ شعر دیکھیے

پھول سے گفتار کرنا سیکھ لے اور بات کر

لہجہ رواں سے ندی اور خوش کو صبا کی ذات کر

فلسفہ حیات و مرگ

ناطق کے ہاں موت و حیات کا فلسفہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ غزل کا عمومی رجحان حسن و عشق ہے مگر ناطق نے غزل میں نئے موضوع تلاش کیے اور ان کو بخوبی نبھایا۔

ڈاکٹر انوار احمد ناطق کے بارے میں رقمطراز ہیں؛

"علی اکبر ناطق سرائیکی خطے کی دانش سے اس مکالمے کا آرزومند ہے جو ادب کی بنیادی اقدار اور تہذیب و ثقافت کی روح کو ہر لمحے پر عیاں کرتا ہے۔"(۲۰)

ناطق کے ہاں عشق و محبت کا موضوع بہت کم دکھائی دیتا ہے اور زندگی کے باقی مسائل ان کی شاعری میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ کائنات کے اسرار و رموز کو اشعار کے پیرائے میں اس نزاکت سے ڈھالتا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھے جا سکتے ہیں:

چاہ سے اور غار سے ہو کر

تارا اترا ہے تار سے ہو کر

اس شعر میں ناطق نے خوبصورت تلمیحات استعمال کی ہیں۔ چاہ اور غار کی اس قدر جاندار صورت شعر میں برتی ہے اور رعایت لفظی کا ایسا استعمال بہت کم شعراء کے ہاں ملتا ہے۔ اس شعر میں آفاقیت بھی ہے اور رموز بھی۔

برف کا اجلا پھول میں لاؤں ، کیسی شرط لگا کر اس نے دور پہاڑ پہ بھیجا مجھ کو
بات یہ برفوں بیچ کھلی ہے، برف کے اجلے پھولوں والے برف ہوئے ہیں، لوٹ نہ پائے

اس شعر میں جو مضمون ناطق نے باندھا ہے وہ ہماری جدید شاعری میں ناپید ہے۔ حسن وعشق اور ہجر و وصال کے علاوہ شاعری میں کوئی ایسی آرٹ کا ہونا جو کہ شعر کی زندگی بڑھادے اور پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ علی اکبر ناطق کے ہاں ایسے بے شمار شعر مل جائیں گے۔

ارسلان احمد راٹھور ناطق کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اگر ناطق نے پرانی دلی کی چوڑی اینٹوں والی گلیوں میں چل چل کر پاپوش نہ گھسائے ہوتے تو شائد ایسا منہ بولتا اور پھڑکتا شعر مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ لیجئے بات چل نکلی تو واقعہ بھی سن لیں، ناطق جب دلی سدھارے تو وہاں کے دوستوں سے مہرولی کے صدیوں پرانے آموں کے ان گھنے باغوں کا سراغ پوچھتے پھرے جن کے نشان یہ پہلے سے آزاد ،فرحت اللہ بیگ، ناصر نذیر فراق ،اشرف صبوحی اور حیرت دہلوی کی تحریروں میں پاچکے تھے، دلی کے دوستوں نے تو اپنی لاعلمی کا عذر کیا لیکن ناطق صاحب اپنی دھن کے پکے ٹھہرے، پورا دن پا بہ شوق مہرولی کی قرن دیدہ گلیوں میں گھومتے پھرے، آخر مہرولی سے پان سات میل پرے کھنڈرات کے پہلو میں مطلب بر آری ہوئی، دلی کے یار بھی حیران ٹھہرے۔''(۲۱)

مغرب میں غزل کے بہت سے جدید پہلو نظر آتے ہیں اردو غزل کوئی بھی تبدیلی بہت جلد قبول نہیں کی جاتی۔ ناطق کے ہاں اردو غزل میں بے شمار نئی تراکیب دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ناطق نے مذہب کو اپنی شاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل ایک خاص اہمیت دی ہے۔ ان کی شاعری میں مذہب کے اسرار و رموز سے لے کر مذہب پر طنز اور مذہب سے محبت تک تمام عوامل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں ناطق کے اشعار دیکیں:

ہم کہ غزالاں شہر اماں کا رستا پوچھتے پھرتے ہیں
صحن حرم کو روک کے بیٹھے مجد کے سگ اور بدو لوگ

کعبے کے مضافات نے مجنوں کو کیا پاک
ہر عہد کا باشندہ ازل تا ہی ٹھہرا خاک

مندروں کے صحن میں صدیوں پرانی گھنٹیاں
دیویوں کے حسن کے کہنہ حوالے شہر کے

ایڑیاں رگڑے دم دم خاطر ایک پہر شش ماہہ
اک شش ماہہ جنگ لڑے اور خون کا چشمہ پھوٹے

ان تمام اشعار کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ مذہب سے ہے۔ ناطق نے مذہب کو غزل کا موضوع بنا کر ایک روایت قائم کی ہے۔ ان سے پہلے بہت سے شاعروں نے مذہب کو غزل میں برتا ہے مگر جس تواتر اور باریک بینی سے ناطق کی غزل میں مذہبی استعارے اور تلمیحات ملتی ہیں جو قابل غور ہیں۔ اس کے علاوہ ناطق کی غزل میں کچھ عروضی لاپرواہی نظر آتی ہے۔ موضوعات، فکر اور کرافٹ کے حوالے سے غزل کا آہنگ قاری کو زیادہ متاثر کرتا نظر نہیں آتا۔

گو ناطق کو عہد حاضر کے نقاد بڑا غزل گو نہیں مانتے غزل کے حوالے سے ان پر بے شمار اعتراضات بھی اٹھائے گئے ہیں۔ عہد حاضر کے غزل گو شاعر " اکرام عارفی " نے بھی منہاج یونیورسٹی کی ایک ادبی تقریب میں ناطق کی غزل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ناطق کی غزل کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی اور اس کی غزل نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا ہے۔

ناطق کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے ظفر اقبال اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

"برادم افتخار عارف کے بقول اس شاعری کو سمجھنے کے لیے آپ کو شعر فہمی کی گہرائیوں میں اترنا ہوگا' جبکہ میری ناقص رائے میں شعر وہ ہوتا ہے' جو عام قاری کو بھی اپیل کرے اور خاص کو بھی اور اس میں لطفِ سخن بھی ہو؛ چنانچہ یہ شاعری خاص' بلکہ خاص الخاص قارئین کے لیے ہے' جن میں خود میں بڑا مشکل سے فٹ ہوتا ہوں۔ شعر کی پوشاک' جو بھی ہو' موضوع کی بھی کوئی قید نہیں' لیکن اس میں شاعری کا ہونا از بس ضروری ہے۔ ہنر وری اور کاری گری کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا' لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شعر' شعر بنا ہے یا نہیں اور علی اکبر ناطق ایسا شعر کہنے کی قدرت بھی رکھتا ہے' جو ہر طرح کے باذوق قاری کو اپیل کرے' جو شعر کا بنیادی مقصد بھی ہے۔"(۲۲)

عروضی تخریج:

علی اکبر ناطق کی غزل کا فنی و فکری جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ علم عروض کی لافانی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اور ناطق کی غزل کے عروضی نظام کو سمجھنے کے لیے ان کے غزل کے اکلوتے مجموعے "سبز بستیوں کے غزال" کی عروضی تخریج کی ہے۔ جس میں کچھ غزلوں کے بعض اشعار میں علم عروض کی رو سے لاپرواہی برتی گئی ہے۔ اس حوالے سے شعر درج ذیل ہے:

"گلوں کی کھیتیاں کاٹیں ترے شہیدوں نے

صفائے خوں کے عزادار عزا میں شاد رہے" (۲۳)

اس شعر میں دوسری بار آنے والا لفظ "عزا" وزن سے باہر ہے۔ اور مستعمل نہیں ہے۔

علی اکبر ناطق کی تمام غزلوں کی عروضی تخریج ملاحظہ ہو:

غزل ۴

سبز شیشے بیریوں کے بیریاں پنجاب کی

چکنی شاخوں کی رگوں میں نیلی لہریں آب کی

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۵

پھول پری جب اڑ جائے گی پھر مانگیں گے خوشبو لوگ

وحشی نافہ گر اس نہ رہے تو ڈھونڈنے بھاگے ہر سو لوگ

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

غزل ٦٦

قصر و مکاں سب ڈوب چکے ہیں دریا ڈوبنے والا ہے

کتنی گہری آنکھوں والا اس بستی سے گزرا ہے

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

غزل ۷۷

حریم دل، کہ سر بسر جو روشنی سے بھر گیا

کسے خبر میں کن دیوں کی راہ سے گزر گیا

بحر: ہزم مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل ۹۸

کعبہ کے مضافات نے مجنوں نہ کیا پاک

یہ مجد کا باشندہ اڑاتا ہی پھرا خاک

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوب

وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل ۹۹

ہوا کے تخت پر اگر تمام عمر تو رہا

تجھے خبر نہ ہو سکی، یہ ساتھ ساتھ میں بھی تھا

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل ۱۰۰

ثواب و زہد میں جو دن گزارے رکھ دیے گئے

ترے حضور میں گنہ یہ سارے رکھ دیے گئے

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل۱۱۱۱

کسے کجاوے محلوں کے اور جاگا رات کا تارا بھی

چھوڑ دی بستی ناقوں نے خاموش ہوا نقارہ بھی

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

غزل۱۱۲۲

چاندی والے شیشے والے آنکھوں والے شہر میں

کھو گیا اک شخص مجھ سے دیکھے بھالے شہر میں

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل۱۱۳۳

اگر صلیب سر پھروں کے سر سنبھالتی رہی

جنوں کی آگ روشنی کی رسم ڈالتی رہی

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل ۱۴۰

میرے سپاہی تو نے اپنی بستی کے سر لوٹے

تیرے بازو شل ہو جائیں تیرا دشنہ ٹوٹے

بحر: مثمن مخبون مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

غزل ۱۵۱

چشم پر آب نے نظر کی ہے

مشک دل روشنی سے بھر دی ہے

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل ۱۶۶

غنچہ غنچہ ہنس رہا تھا پتی پتی رو گیا

پھول والوں کی گلی میں گل تماشا ہو گیا

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۱۸۷

کرم کی آگ بجھ گئی تمام اشک رو گیا

نظر کی چاہ میں تمام نور چشم کھو گیا

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل۱۱۸۸

لوگ اڑتے پھرتے ہیں جس آسماں کی چاہ میں

وہ گڑھے ہم چھوڑ آئے تیرے گھر کی راہ میں

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۱۹۱

آگ بھرا ہے برتن دل کا خالص تانبا لال

تپ کر سونا زرد ہوئے ہیں سرخ انگارہ گال

بحر: مثمن مخبون مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل

غزل ۲۲۰

یہ ادھر چلے الٹ پلٹ چراغ میرے بام کے

ہوا سے رات بھر لڑے لووں کی ڈھال تھام کے

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل۲۲۱۱

ایک تماشا سورج والی رات میں ہوگا، ایک دنوں کٹ تاروں میں

یعنی شب بھر دیے جلیں گے، پھول کھلیں گے، صبح کو حیرت یاروں میں

بحر: مثمن مخبون مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فا

غزل۲۲۲۲

وہی پھول ہیں وہی برگ ہیں وہی چاند ہیں ترے شہر کے

مگر آج یہ نہ ہوا کہ ہم انہیں دیکھتے ذرا ٹھہر کے

بحر: مثمن سالم

وزن: متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

غزل۲۲۳۳

جس کے شہروں پر صنوبر اور گاوں کے سائے ہیں

ننگے سورج والیو ہم اس وطن سے آئے ہیں

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۲۴۲

ندیاں پار کرانے والے ڈوب گئے

چپو تیز چلانے والے ڈوب گئے

بحر: متقارب مسدس مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

غزل ۲۵۲

صلیبیں نصب ہو چکیں مضاف شہر میں کنویں بجھا دیے گئے

حضور آفتاب جو چراغ تھے چمک رہے بجھا دیے گئے

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفا

غزل ۲۲۶۶

دن کا سے ہے، چوک کنویں کا اور باگوں کے جال

ایسے میں ناری تو نے چلی پھر تیتری والی چال

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل

غزل۲۲۷۷

ایک دیا شب کے پہاڑوں پہ جلا زرد ہوا

سرد کا چہرہ کھلا، رنگ مرا زرد ہوا

بحر:رمل مثمن سالم مخبون محذوف

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل۲۲۸۸

کنول ہیں آب میں خوش گل صبا میں شاد رہے

ترے حزیں تری آب وہوا میں شاد رہے

بحر: مثمن مخبون محذوف مسکن

وزن: مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

غزل ۲۹

گھنٹیاں بجنے سے پہلے شام ہونے کے قریب

چھوڑ جاتا میں ترا گاؤں مگر میرے نصیب

بحر :رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل۳۳۰۰

امن قریوں کی شفق فام سنہری پریاں

میرے کھیتوں میں اڑ ییں شام سنہری پریاں

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل۳۳۱۱

زرد پھولوں میں بسا خواب میں رہنے والا

دھند میں الجھا رہا نیند میں چلنے والا

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل۳۳۲۲

رو چلے چشم سے گریہ کی ریاضت کر کے

آنکھیں بے نور ہیں یوسف کی زیارت کر کے

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل ۳۳۳

باد صحرا کو رہ شہر پہ ڈالا کس نے

تار وحشت کو گریباں سے نکالا کس نے

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل ۳۴

دید کی لو بجھو گئی ہم کو

پہلی شبنم تھی دھو گئی ہم کو

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل ۳۳۵

تختہ ہات سنبھالے گا

سر کا بوجھ اٹھا لے گا

بحر: متقارب مربع مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فع

غزل۳۳۶۶

چاہ سے اور غار سے ہو کر

تارا اترا ہے تار سے ہو کر

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل۳۳۷۷

قید خانے کی ہوا میں شور ہے آلام کا

بھید کھلتا کیوں نہیں اے دل ترے آرام کا

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل۳۳۸۸

شہر ہوا کی باد ہے ایسی، ہر کس و ناکس پھول رہے ہیں

ہائے غضب کیوں دشت کو چھوڑا، ہم بھی صبا کو بھول رہے ہیں

بحر: متقارب اثرم مقبوض محذوف مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

غزل ۳۹۳۹

تیری گلیوں میں ہوا رات غضب چلتی رہی

صبح تک آگ سی پیشانی میری جلتی رہی

بحر: رمل مثمن سالم مخبون محذوف

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل ۴۰۰

گریے جم جم کے یوں کیے ہم نے

دشت زم زم سے بھر دیے ہم نے

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل ۴۱

روز سپارے پڑھ کر پھونکے، دھاگے باندھے، پیر جتی کے روزے پر سو دیے جلائے

لیکن دل پر سحر کی گانٹھیں ایسے پڑیں تھیں، گرہیں کھولنے والے قل بھی کام نہ آئے

بحر: مثمن مخبون مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

غزل ۴۲

اونچے قصروں کے سائے جب لمبے پڑتے شام ڈھلے

چھوٹی اینٹ کی چوڑی سڑکوں پر ہم چلتے شام ڈھلے

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

غزل ۴۳

گرچہ چالاک ہیں ہشیار نہیں رہتے ہیں

رخ کے سادہ سے یہ پرکار نہیں رہتے ہیں

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل ۴۴

اک خرابے میں گئے دل کو نگر کر لائے

شام کے پاس رکے اور شفق گھر لائے

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

سوال ۴۵

دل ترے غم کو سہہ گیا کیسے

آگ میں پھول رہ گیا کیسے

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

سوال ۴۶

آنکھ کی جھیلیں سرد رہیں تو راہ نکالنا مشکل ہے

بادلوں اور کنول کے بیچ میں کشتی چلانا مشکل ہے

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

سوال ۴۷

اک نظر دیکھ کہ ابھری ہے اداس رنگوں کی

تجھ کو لپک سناتی ہے زباں رنگوں کی

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع

وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل ۴۸

یار کو بزم عدو سے شب بلا لایا ہوں میں

چاند تنہا تھا اندھیروں میں اٹھا لایا ہوں میں

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۴۹

پھول سے گفتار کرنا سیکھ لے اور بات کر

غنچہ روؤں سے نہ ڈر خود کو صبا کی ذات کر

بحر: رمل مثمن محذوف

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل ۵۰

خوف ہے دربار میں اور مسندوں پہ سائے ہیں

قیدیوں کے مطمئن چہروں سے دل گھبرائے ہیں

بحر: رمل مثمن محذوف

وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل۵۱۱

فضا میں گونج رہ گئی ہوا میں لوچ آگیا

یہ کون دشت سے تجھے پکارتا ہوا گیا

بحر: ہزج مثمن مقبوض

وزن: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

غزل۵۲۲

شعر کہے تو چاند بنائے بات کرے تو پھول

چاندنی بیچنے آیا شاعر مسکانوں کے مول

بحر: متقارب مثمن مضاعف

وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل

خاتمہ:

علی اکبر ناطق کی غزل کی کتاب "سبز بستیوں کے غزال "کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد اور اس کی عروضی اور فکری و فنی گہرائی ناپنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ناطق نے برسوں کی خاک چھاننے کے بعد یہ مجموعہ مکمل کیا ہے۔ اس کتاب میں تغزل سے بھرپور غزلیں ہیں۔ لفاظی، اسلوب، خیال اور آہنگ اس قدر مربوط ہے کہ جس کی مثال آج کی غزل میں کم کم ملتی ہے۔ ناطق کے ہاں جدید اور قدیم غزل کا امتزاج ہے۔ یعنی جدید غزل کو قدیم رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ناطق دور حاضر کا ایک اہم غزل گو شاعر ہے جس نے اپنے الگ رنگ اور آہنگ سے اردو غزل کا سرمایا بڑھایا۔

حوالہ جات:

۱۔ جالبی، جمیل (۱۹۹۳) ارسطو سے ایلیٹ تک، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۳۲۰

۲۔ فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۰۶) اردو نظم ۱۹۶۰ کے بعد، دہلی، اردو اکادمی، ص ۴۶

۳۔ آغا، وزیر (۱۹۷۴) نظم جدید کی کروٹیں، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ص ۲۶

۴۔ الایمان، اختر (۱۹۶۵) جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، مضمون مشمولہ "نگار"، کراچی، جدید شاعری نمبر سالنامہ جولائی اگست، ص ۱۴۴

۵۔ گورکھپوری، مجنوں (۱۹٦۵) جدید نظم کی ہئیت و تشکیل، مضمون مشمولہ "نگار"، کراچی، جدید شاعری نمبر سالنامہ۔
جولائی، ص ۱۳۰

٦۔ کاشمیری، حامد (س۔ن) اردو نظم کی دریافت، سری نگر، میزان پبلیشرز، ص ۱۷

۷۔ صدیقی، عقیل احمد (۱۹۹۰) جدید اردو نظم، نظریہ و عمل، علی گڑھ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ص ۴۱

۸۔ اقبال، ظفر (۲۰۱۷) روزنامہ دنیا، لاہور، دال دلیا

۹۔ فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۱۹) ریشم بننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۳

۱۰۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۳) یاقوت کے ورق، کراچی، آج پبلیکیشنز، ص ٦

۱۱۔ سید، زیف (۲۰۱۹) ریشم بننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۸

۱۲۔ ریاض، فہمیدہ (۲۰۱۹) ریشم بننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱٦

۱۳۔ فرخ، اعجاز (۲۰۱۴) فیض شناسی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۱

۱۴۔ اردو لغت (۲۰۱۳) تاریخی اصول پر، جلد چہار دہم، کراچی، اردو لغت بورڈ، ص ۳۹۰

۱۵۔ اعظمی، خلیل الرحمن (۱۹٦۹) غزل کی جدیدیت، مشمولہ (جدیدیت تجزیہ و فہیم) لکھنؤ، نسیم بک ڈپو۔ ص ۳۹٦

۱٦۔ حسینی، عامر (۲۳۔۲۔۲۰۲۰) مصاحبہ از راقمہ، لاہور، پاک ٹی ہاؤس

۱۷۔ حالی، الطاف حسین (۲۰۰۹) مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، مشتاق بک کارنر، ص ۹۳

۱۸۔ عارف، افتخار (۲۰۱۸) سبز بستیوں کے غزال، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۹

۱۹۔ گڈریڈرز، ۱۰ دسمبر ۲۰۱۹، ۱۳:۲

۱۲۲۹۱۲۹۴https://www.goodreads.com/book/show/

۲۰۔ احمد، انوار (۲۰۱۹) دسمبر ۱۰

&id=۲۵۴۹۸۳۱۴۹۵۳۰۵۴۲۳https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=
۱۰۰۰۰۸۳۵۷۹۲۷۱۲۲

۲۱۔ راٹھور، ارسلان احمد (۲۰۱۸) سبز بستیوں کے غزال، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۸۹

۲۲۔ اقبال، ظفر (۲۹۔۱۱۔۲۰۱۹) روزنامہ دنیا، لاہور، دال دلیا

۲۳۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) سبز بستیوں کے غزال، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۴۳

باب سوم

عاشق کی فکشن نگاری کی جہت

علی اکبر ناطق کی افسانہ نگاری:

علی اکبر ناطق نے فکشن نگاری کا آغاز افسانے سے کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "قائم دین" ۲۰۱۲ میں سامنے آیا۔ اس کے بعد ناطق نے ناول کی طرف قدم بڑھایا اور ۲۰۱۴ میں ان کا ناول "نولکھی کوٹھی" ادب کی دنیا میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوا۔ ۲۰۱۷ میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "شاہ محمد کا ٹانگہ" شائع ہوا۔ اس کے بعد ۲۰۱۹ میں مرقع آزاد "فقیر بستی میں تھا" منظر عام پر آیا۔ یہ ان کے ایم فل کا مقالہ تھا جسے بعد میں انہوں نے سوانحی ناول کی شکل میں شائع کیا۔ یہ سوانحی ناول ناطق کی اب تک کی آخری کتاب ہے۔ فکشن کے باب میں ناطق کی اب تک چار کتابیں آچکی ہیں۔ ان کے دونوں افسانوی مجموعے کافی پزیرائی حاصل کر چکے ہیں اور ان کا اکلوتا ناول "نولکھی کوٹھی" جس کا دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس ناول کے اب تک سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ناطق کی فکشن کی کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ قائم دین (افسانے) ۲۰۱۰

۲۔ نولکھی کوٹھی (ناول) ۲۰۱۴

۳۔ شاہ محمد کا ٹانگہ (افسانے) ۲۰۱۷

۴۔ فقیر بستی میں تھا (مرقع آزاد) ۲۰۱۹

علی اکبر ناطق کی فکشن کی پہلی کتاب ان کا افسانوی مجموعہ ہے اس لیے ہم پہلے ان کے افسانوں پر روشنی ڈالیں گے۔

اردو افسانے کی روایت:

تعریف:

افسانہ نثری ادب کی ایک صنف ہے۔ افسانہ کے لغوی معنی قصہ، کہانی کے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں لوک کہانی کو افسانہ کہتے ہیں۔ یہ اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ایک نشست میں پڑھا جاسکے۔ اس میں وحدت تاثر پایا جاتا ہے اور میں شروع سے آخر

تک ایک موضوع کو دلچسپی اور اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر ناول کل ہے تو افسانہ ایک جز ہے۔ افسانے کو کہانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ترتیب کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ افسانے میں اختصار اور ایجاز بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں افسانے کے لغوی معنی کچھ اس طرح سے درج ہیں:

"حکایت بے اصل، قصہ، کہانی، من گھڑت کہانی، گھڑا ہوا قصہ، جھوٹی بات، سرگزشت، حال، ماجرا، ذکر۔"(۱)

افسانے کی تعریف میں سید وقار عظیم رقمطراز ہیں:

" افسانہ، کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعہ، ایک جذبے ایک احساس، ایک تاثر۔ ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔"(۲)

افسانہ ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ داستان جو مختصر ہو کر تبدیلیوں کے ساتھ ناول کی شکل اختیار کر گئی اور ناول کی مختصر شکل افسانہ ہے۔ مگر ناول میں ایک سے زیادہ کہانیاں پائی جاتی ہیں جب کہ افسانہ صرف ایک کہانی یا قصے پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا دورانیہ آدھا گھنٹہ ہے۔ یہ سادہ دلچسپ اور مختصر ہوتا ہے۔

ممتاز شیریں افسانے کی تعریف کچھ اس طرح سے کرتی ہیں:

"خام زندگی سے کٹا ہوا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی مختصر افسانہ بن سکتا ہے۔ طویل افسانے مختصر افسانے کے لیے تکمیل کا احساس اور زیادہ بھرپور زندگی کی پیش کش ضروری ہے۔"(۳)

سلام سندیلوی افسانے کے باب میں رقمطراز ہیں:

"عدیم الفرصتی کی بنا پر انسان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ ضخیم کتب کا مطالعہ کر کے طولانی ناولوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس کو مختصر ادبی فن پاروں کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ وہ اپنی روحانی تشنگی کو بجھا سکے۔ ان ہی حالات کے تحت افسانے کی ایجاد ہوئی۔"(۴)

ناول چونکہ طویل ہوتا ہے اور اس میں کم از کم چار پانچ ذیلی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس میں طوالت اور پیچیدگی ہوتی ہے جسے کم وقت میں سرسری طور پر نہیں پڑھا جا سکتا۔ جب کہ افسانہ عام فہم اور ایک کہانی پر مرکوز ہوتا ہے۔ جدید دور میں وقت کے کمی اور مشینی زندگی کے باعث افسانے کو پزیرائی ملی کیوں کہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا افسانے کے مختصر کینوس کے متعلق رقم طراز ہیں:

"ناول یا داستان کا کینوس نسبتاً بڑا ہوتا ہے اور اس میں ان گنت کردار اور واقعات کسی بنیادی واقعہ یا کردار کی تعمیر میں صرف ہوتے ہیں۔ یوں کہ اس واقعہ یا کردار کی نسبت سے سارا مکانی یا زمانی کینوس منور ہو جاتا ہے۔ مگر افسانہ واقعہ یا کردار کے ایک خاص پہلو کو سامنے لاتا ہے اور سارے کینوس کو منور کرنے کے بجائے صرف اس گوشے کو منور کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔"(۵)

روایت:

اردو میں افسانے کی صنف مغرب سے آئی ہے۔ گو کہ اردو ادب میں داستان گوئی کا رواج پہلے سے موجود تھا اور پھر وہ کچھ تکنیکی تبدیلیوں کے ساتھ ناول میں تبدیل ہو گیا۔ اور ناول کی اگلی شکل افسانہ ہے۔ افسانے کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے مگر اس صنف ادب نے بہت جلد ترقی کی منازل طے کر لیں۔ بیسویں صدی میں اس صنف سخن کو باقاعدہ اپنایا گیا اور الگ پہچان ملی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے افسانے کا وجود نہیں تھا۔ البتہ اردو کے پہلے افسانہ نگار کو لے کر بحث موجود ہے اور اس بارے میں مختلف نقاد مختلف رائے رکھتے ہیں۔ " ۱۹۵۵ " کے نقوش کے افسانہ نمبر میں شائع ایک بحث

کے مطابق وقار عظیم نے پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا ہے۔ ان کے علاوہ زیادہ تر نقاد پریم چند کو ہی اردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ماننے والے نقادوں میں پروفیسر احتشام حسین، پطرس بخاری اور ڈاکٹر معین الرحمن شامل ہیں۔ جب کہ مرزا حامد بیگ نے راشد الخیری کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ اردو کے قدیم مجلوں اور رسالوں سے اردو کے اولین افسانوں اور افسانہ نگاروں کی فہرست معلوم کی جائے تو اس کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

۱۔ نصیر اور خدیجہ از راشد الخیری، مطبوعہ "مخزن" جنوری ۱۹۰۳، لاہور

۲۔ چھاؤں از علی محمود، مطبوعہ "مخزن" جنوری ۱۹۰۴، لاہور

۳۔ دوست کا خط از سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ "مخزن" اکتوبر ۱۹۰۶، لاہور

۴۔ عشق دنیا اور حب وطن از پریم چند، مطبوعہ "زمانہ" اپریل ۱۹۰۸، کانپور

اس طرح اردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار راشد الخیری ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم دوسرے اور پریم چند تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔

راشد الخیری نے طبع زاد افسانے میں پہل کی مگر پریم چند کو افسانے کے ضمن میں متعدد کارگزاریوں کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔ اردو کے اولین افسانہ نگار راشد الخیری، سلطان حیدر جوش، سجاد حسین یلدرم، منشی پریم چند کا زمانہ ایک ہی تھا مگر ان سب کا سلوب اور موضوع بالکل جدا ہیں۔

سرسید اور آزاد کی نگارشات میں ابتدائی افسانے کے پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فیض احمد فیض افسانے کی ابتداء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "شروع شروع میں یہ افسانے رسمی طور پر لکھے جاتے تھے۔ اور بیشتر انگریزی سے تراجم ہوتے تھے یا انگریزی کرداروں کے نام اور واقعاتی مناظر کو ادل بدل کر انہیں ہندوستانی لباس پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طبع زاد افسانے اکثر

> رومانوی یا سراغ رسانی رنگ میں لکھے جاتے تھے ان افسانوں کو نہ پڑھنے والے
> کوئی ادبی اہمیت دیتے تھے نہ لکھنے والے انہیں اپنی ادبی سرگرمیوں کا اہم جزو
> خیال کرتے تھے۔ اس زمانے میں دو مشہور مصنفیوں نے افسانہ نگاری کے
> میدان میں قدم رکھا۔ ایک سید سجاد حیدر یلدرم اور دوسرے منشی پریم چند۔
> یلدرم کی پرجوش رومانیت اور پریم چند کی مؤثر حقیقت نگاری نے اردو میں
> افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔"(٦)

یلدرم ایک رومانوی افسانہ نگار ہے۔ یلدرم نے محبت اور عورت کو اپنے افسانے کا مرکزی موضوع بنایا اس کے افسانوں میں محبت، عورت، جنس نمایاں ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور ان کے افسانوں میں ان کی معاشرت کا رنگ نمایاں ہے۔ وطن سے محبت معاشرت سے محبت پریم چند کے افسانے کا خاصہ ہے۔ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں اردو افسانے نے کروٹ بدلی اور "انگارے" کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ سامنے آیا۔ اس نے اردو افسانے کا رخ موڑ دیا۔ سجاد ظہیر اور دیگر کے یہ افسانے اور تحریک ایک عملی شکل میں سامنے آئی۔ اس تحریک نے اس طبقے کے خلاف قلمی جہاد کیا جو غریبوں کا معاشی اور معاشرتی استحصال کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، بھی اس تحریک کا حصہ تھے۔ منٹو کو بھی پہلے پہل اس میں شامل کیا گیا مگر بعد میں ان کو الگ کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد نمائندہ افسانہ نگاروں میں پہلا نام غلام عباس کا آتا ہے جن کا پہلا فسانوی مجموعہ ۱۹۴۸ میں شائع ہوا۔ ان اس کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی اور اردو افسانے کو ایک راستہ مل گیا۔ علی اکبر ناطق اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں ہر طرف مشینوں نے انسان کو گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرنے کا عادی بنا دیا ہے وہیں افسانہ ایک مقبول ترین صنف سخن بن گیا ہے کیوں کہ اس میں اختصار اور جامعیت ہے۔

نئے افسانے کے بارے میں شہزاد منظر لکھتے ہیں:

"یہ درست ہے کہ جدید افسانہ کہانی بیان نہیں کرتا نہ اس کا کوئی متعین پلاٹ ہوتا ہے۔ جدید افسانہ میں پلاٹ کو ثانوی حیثیت ہوتی ہے۔ اولیت مرکزی تصور اور فکر کو حاصل ہوتی ہے۔ افسانے میں کردار، مناظر اور واقعات کی محض دھند ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کامیاب افسانہ کی پہچان یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا افسانے کے مرکزی خیال یا فکر سے گہرے طور پر متاثر ہو اور اس پر معنویت کی پرت کھل جائیں۔"(۷)

علی اکبر ناطق بطور افسانہ نگار:

علی اکبر ناطق نے فکشن نگاری کا آغاز افسانے سے کیا ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "قائم دین" ۲۰۱۰ میں شائع ہوا جس میں کل ۱۵ افسانے شامل ہیں ناطق کا دوسرا افسانوی مجموعہ "شاہ محمد کا تانگہ" ۲۰۱۷ میں شائع ہوا اس میں کل "۱۴" افسانے شامل ہیں۔

قائم دین

اس افسانوی مجموعے کا انتساب معروف شاعر "افتخار عارف" کے نام ہے۔ اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۵ افسانے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اچھو بازی گر

۲۔ بے چارگی

۳۔ قائم دین

۴۔ جودھ پور کی حد

۵۔ کمی بھائی

۶۔ معمار کے ہاتھ

۷۔ مولوی کی کرامت

۸۔ مومن والا کا سفر

۹۔ نرینہ اولاد

۱۰۔ شہابو خلیفہ کا شک

۱۱۔ شاہ مدار کی پازیبیں

۱۲۔ شریکا

۱۳۔ تابوت

۱۴۔ والٹر کا دوست

۱۵۔ شیدے نے پگڑی باندھ لی

شاہ محمد کا ٹانگہ

علی اکبر ناطق کا دوسرا افسانوی مجموعہ "شاہ محمد کا ٹانگہ" ۲۰۱۷ میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا انتساب" سید گلزار حسنین" کے نام ہے۔ اس مجموعے کو بہت پزیرائی ملی اور اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۴ افسانے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کت

۲۔ جیرے کی روانگی

۳۔ شاہ محمد کا ٹانگہ

۴۔ الہٰ دین کی چارپائی

۵۔ زیارت کا کمرہ

۶۔ نسلیں

۷۔ پانڈوکے

۸۔ گرو

۹۔ سفید موتی

۱۰۔ ولی کا مرقع

۱۱۔ سیاہ ٹھپا

۱۲۔ تمغہ

۱۳۔ سویٹر

۱۴۔ حاجی ابراہیم

ناطق کے افسانوں کا فکری و فنی جائزہ۔

اردو افسانوں میں عام طور پر جس چیز کو زیادہ موضوع بنایا گیا ہے وہ طوائف، جنس، سیاست، مذہب اور معاشی مسائل ہیں۔ مگر جدید افسانے میں ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل کو شامل کر لیا اور افسانے کی مروجہ روایات کو بدل کر نئے اجزائے ترکیبی متعارف کروائے۔ علی اکبر ناطق جدید افسانے میں ایک اہم نام ہیں۔ ہم ناطق کے افسانے کے اہم نکات پر بحث کریں گے۔

دیہی معاشرت:

افسانے میں دیہات اور اس کی معاشرتی زندگی کو پہلے بھی موضوع بنایا جا چکا ہے۔ منشی پریم چند کی طرح ناطق اپنے دیہی ماحول اور معاشرت سے بہت قریب ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں گاؤں کی زندگی کا عکس پیش کیا۔ ان کا اسلوب شائستہ اور سادہ ہے۔ کھیت کھلیان، پنجابی الفاظ، دیہاتی کردار اور افسانے کی فضا دیہاتی معاشرت کی عکاس ہے۔ کم و بیش ہر افسانے میں پنجابی دیہی معاشرت نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے "کت" کا اسلوب، ماحول، زبان، موضوع خالصتاً پنجابی اور دیہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"اس بات کو چھوڑو، شمشیر نے بختو کی زنجیر اپنی ٹانگ سے باندھ کر ہاتھوں کو آزاد کیا اور بولا، ایک بار میں یونہی پگڈنڈی کنارے جا رہا تھا۔ یہ بھاگاں والی بختو آگے آگے ٹھمکتی جاتی تھی۔ ہم پگڈنڈی پر تھے اور دونوں جانب اونچے اونچے کماد کے کھیت تھے۔ اچانک ایک ہی بار جھٹکا سا ہوا اور میرے دیکھتے ہی بختو غائب۔ چوں تک نہ کی بچاری نے۔ بس ایک جھپکے کی دیر میں کماد سے بھگیاڑ نکلا اور دیکھتے ہی بختو کو گردن سے دبوچ کر اسی کماد میں جا گھسا۔ تمہیں تو پتا ہے میری اس کرماں والی میں جان ہے میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اب جو دیکھا تو تین تین بھگیاڑ تھے۔ بختو بچاری مدھولی جا چکی تھی۔"(۸)

ناطق کے افسانوں کی فضا حقیقت کے قریب ہے اور ان کی زبان سادہ ہے۔ ان کے افسانوں پر پنجابی کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کی بنیاد پنجابی ثقافت ہے اس لیے ہر کہانی گاؤں کی کہانی ہے۔ ناطق نے شہر والوں کے سامنے گاؤں کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جس سے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر پڑھنے والے بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے وہ گاؤں کے کسی تھڑے پر بیٹھ کر خود یہ منظر دیکھ رہے ہوں۔

"وہ کھوہ پر پہنچا تو شبیرا بھینسوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوی جس کا دستہ چھے فٹ لمبے بانس کا تھا، شریہنہ کے تنے کے ساتھ لگا دی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا میں بھی کوئی بزدل نہیں۔ آدھ سیر دیسی گھی تو میری ایک دن کی خوراک ہے۔ گاؤں میں بس یہ شبیرا ہی ایک ایسا ہے جو میرے مقابلے کا ہے لیکن یہ بھی میرا ہی آدمی ہے ویسے بھی جب یہ فیروزپور سے آیا تھا تو میں نے ہی اس کی مدد کی، رہنے کو اپنے کھوہ پر جگہ دی۔ آج سات سال ہو گئے میری ہی زمین کاشت کرتا ہے۔"(۹)

ان اقتباسات میں گاؤں کا جو نقشہ ناطق نے کھینچا ہے وہ قاری کی دلچسپی کا باعث ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے قاری خود کو اسی جگہ محسوس کرتا ہے جہاں افسانہ اور اس کے کردار موجود ہوں۔ ناطق کی کہانی دیہات کی کہانی ہے۔ وہ گاؤں کی ایک ایک

چیز پر توجہ دیتا ہے اور اسے اپنے فن سے کہانی بنالیتا ہے۔ ناطق چوپال میں بیٹھے ہوئے، گویّوں کے قصے کہانیاں سن کر بڑا ہوا ہے اس نے اپنے ذہن میں موجود تمام قصے اپنی فنی مہارت سے افسانے بنادیے۔ اس لیے اس کے افسانے میں ایک ایک چیز حقیقی معلوم ہوتی ہے وہ کسی بھرتی کے فقرے یا واقعے کو کہانی کا حصہ نہیں بناتا۔ اور گاؤں کے کردار، زبان، دیہات، ماحول سب کچھ من و عن لکھتا ہے۔ جس سے اس کی تحریر میں خاص پن آجاتا ہے۔ منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، ابوالفضل صدیقی، منشا یاد، اور کسی حد تک احمد جاوید وہ افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں دیہات اور گاؤں کی معاشرت ان کے افسانے کا بنیادی حصہ ہے۔ جدید افسانہ نگاروں میں علی اکبر ناطق ہی اس روایت کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے میں دیہی پنجابی ثقافت کو مکمل کر بیان کیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اس بابت لکھتے ہیں:

> "سماج سے ادب کا رشتہ ہی اصل چیز ہے۔ جس ادیب کو ان رشتوں کا ادراک
> نہیں میرے خیال میں اس کا ادب اور فن بے معنی ہے۔"(۱۰)

علی اکبر ناطق نے نہ صرف دیہات کے مسائل کو مکمل کر بیان کیا بلکہ اس نے دیہات اور گاؤں کی معاشرت کو پھلنے پھولنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور اس مشینی دور میں دیہات کی اہمیت کو واضح کیا۔ ناطق کے افسانے کا دیہات اتنا قدیم نہیں ہے بلکہ دور جدید کی ہم آہنگی بھی اس میں نظر آتی ہے۔

اسلوب:

ناطق صاحب اسلوب افسانہ نگار ہے۔ ناطق کرداروں کو جو زبان دیتا ہے وہ جیسے اسی کردار کے لیے ہی بنی ہوتی ہے۔ ناطق کے افسانے میں اس کا اسلوب بھاتا ہے۔ کہانی خواہ گھر کی ہو یا پھر کسی بازار کی جب ناطق وہ کہانی لکھتا ہے تو اس میں ناطق کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ جدید افسانے میں بہت کم افسانہ نگار سامنے آئے ہیں جن کا اسلوب الگ اور منفرد ہو اور وہ اپنے کرداروں، کہانی، زبان اور اسلوب سے پہچانے جائیں۔ ناطق ان میں سے ایک ہے۔ ناطق کے ہاں اسلوب اور بیان کا ساتھ تمام کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ناطق کا اسلوب سادہ ہے اور اس پر پنجابیت کا رنگ ہے۔ قاری کو کہیں بھی دقیق

اور مشکل الفاظ میں پھنسا کر اپنے علم کا رعب نہیں ڈالا گیا بلکہ اسلوب کو اس قدر سادہ رکھا گیا کہ قاری کہانیاں پڑھتے ہوئے خود کو ان کہانیوں کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ ناطق کا اپنا منفرد اسلوب ہے اور وہ اس کی چھاپ قاری کے دل و دماغ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ علامتی افسانہ لکھتے ہیں اور ایک ایک بات سے کئی معانی نکالنے کے عادی ہیں۔ ان کے علامتی افسانے کاٹ دار ہیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدات کو اپنی داخلیت میں سمو کر دور رس لفظی پیکر میں ایسے استعمال کرتے ہیں کہ معانی اور امکانات کی کئی جہتیں کھل جاتی ہیں۔ ناطق نے علامتی افسانے کا ذریعہ اظہار بنایا۔ حقیقت نگاری کا رد عمل علامتی افسانہ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

"ہمارا علامتی افسانہ ایک طرف تو بے رحم حقیقت نگاری کی روش سے انحراف کا عمل تھا۔ دوسری طرف سیاسی جبر کی فضا میں سانس لینے کی ایک کاوش اور تیسری طرف (اور یہی سب سے اہم بات ہے) شے، کردار یا کہانی کے باطن میں موجود پر اسراریت کا ادراک کرنے کے عالمی رجحان سے منسلک ہونے کا ایک اقدام تھا۔ ہمارے جدید علامتی افسانہ نے بے حد نازک اور لطیف نفسی کیفیات اور معنی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ جو رومانی انداز یا حقیقت پسندانہ عکاسی کے مقابلے میں ایک نسبتاً مشکل عمل ہے۔۔۔۔۔ علامتی افسانہ نے سائیکی کی گہرائیوں میں اتر کر کیفیات کو اور واردات کو مس کیا ہے اور یہ عمل گرامر میں جکڑی ہوئی زبان کے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ علامتی افسانہ خود کو حقیقت سے منقطع نہیں کرتا تاہم وہ خود کو حقیقت کی محض بالائی سطح تک محدود بھی نہیں رکھتا، بلکہ سدا شے یا کردار یا فضا کو بنیاد بنا کر دوسری جانب کی پر اسراریت کو مس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے باعث افسانہ میں معنی کے کئی پرت پیدا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ علامتی افسانہ لفظ کی قلب ماہیت کر کے اسے معانی کو گرفت میں لینے کے قابل بناتا ہے۔"(۱۱)

زبان و بیان:

علی اکبر ناطق کے افسانے میں پنجابی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب پنجابی ہے۔ اور ان کے افسانے کی کہانی بھی پنجابی ہے۔ افسانے کے اندر پنجابی الفاظ کی کثرت موجود ہیں اور پنجابی محاورات اور لوک اشعار بھی ناطق کے افسانے کا حصہ ہیں۔ ناطق کے افسانے میں کرداروں کے نام مقامات کے نام اور روایات و واقعات بھی پنجابی ہیں۔ پنجابی شعر اور لوک گیت بھی افسانے کا حصہ ہیں۔

سماجی مسائل کا بیان:

علی اکبر ناطق کے افسانوں میں سماجی سیاسی ناہمواری کے بارے میں گہرا طنز نظر آتا ہے۔ ناطق ذات پات کے مسائل جیسے اور سماجی گھٹن پر بے باک طریقے سے بات کرتا ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "قائم دین" میں ان کا افسانہ "بے یرگ" ایک مکمل سماجی فکر کا افسانہ ہے۔ جسے ناطق نے اپنے مخصوص انداز میں بے باکی سے بیان کیا ہے۔ علامتوں اور ڈھکے چھپے الفاظ کا سہارا لے کر کوئی بات لکھنا ناطق کے مزاج میں نہیں وہ ہر بات کھل کر بیان کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اس معاملے میں وہ دوسرے بہت سے جدید افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں۔ ناطق معاشرے کی برائی کو اسی برائی کے انداز میں بیان کرتے ہیں کیونکہ اگر معاشرہ وہ برائی برداشت کر سکتا ہے تو اس کا بیان بھی برداشت کر سکتا ہے۔:

> "راؤ صاحب میں نے سوچا، میں بھی آپ کو مبارک باد دے آؤں اور تحفہ (بوری کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ نوٹوں کے ہار اور مٹھائی تو آئی جاتی شے ہے لیکن جیسی شاندار آپ نے آج کامیابی حاصل کی ہے، ویسا ہی تحفہ بھی ہو یہ کہہ کر اس نے بوری کا منہ کھول دیا، جسے دیکھ کر راؤ جمیل اور دوسرے تمام لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔
>
> بوری میں راؤ شوکت خاں کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے، جنمیں سب سے بڑا ٹکڑا سر کا تھا۔
>
> راؤ صاحب "نورا پھر بولا" میں نے سوچا آپ شریف آدمی ہیں۔ یہ شوکت خاں آپ کو ذلیل کرے گا۔ آج پھر یہ لیغاں کے پاس چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک اور نورا یا لیغاں پیدا ہو جاتی۔ ادھر آپ راجپوت ہیں۔

راؤ جمیل خاں کو ایسے لگا، جیسے یہ آواز کسی گہرے کنویں سے سن رہا ہو۔"(۱۲)

اس افسانے میں ناطق نے ایک اہم سماجی مسئلہ اٹھایا ہے۔ گاؤں دیہات میں یہ مسائل بالکل عام ہیں۔ کہ وڈیرے یا گاؤں کے چوہدری سرعام غریب عورتوں کا استحصال کرتے ہیں ان سے جسمانی تعلق قائم کرتے ہیں اور انھیں ذلیل و رسوا کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ افسانہ بھی اسی سماجی مسئلے کا پرچار ہے۔ اس افسانے کا کردار "نورا" جس کی ماں کو چوہدری اپنی عیاشی کا سامان بناتے ہیں اور نورے کو بے عزت کرتے ہیں کہ اپنی ماں سے پوچھو کہ تمہارا باپ کون ہے کہاں ہے۔ اور آخر میں نورا نفسیاتی طور پر بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ چوہدری کے بیٹے کو قتل کر دیتا ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کے نفسایاتی مسائل کو بھی بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے کہ کیسے ایک انسان اور اس کی ساری نسل پر یہ نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ وہ نیچ یا کم تر ہیں اور ظلم برداشت کرنا ان کا فرض ہے۔ سماج مسائل کا بیان اردو افسانے کی روایت ہے۔ ہر بڑے افسانہ نگار نے اسے اپنے طریقے سے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر شکیل احمد رقمطراز ہیں:

> "اردو افسانے میں ذات پات کی تفریق، چھوت چھات کا تصور اور اونچ نیچ کی تقسیم ابتداء سے ہی موضوع بحث رہی ہے۔ یلدرم اور پریم چند سے لے کر آزادی سے قبل تک لکھنے والے تقریباً ہر افسانہ نگار نے اس موضوع کو اپنے افسانے میں جگہ دی۔ رومانی افسانوں میں بھی جس کا موضوع بہت کچھ جداگانہ ہوتا ہے وہاں بھی اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ذات پات اونچ نیچ کی تفریق کے موضوع کو لے کر اردو افسانہ نگاروں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔"(۱۳)

سماجی مسائل اور ان کا بیان اردو افسانہ نگاروں کا اولیں موضوع ہے۔ معاشی مسائل، نفسیاتی مسائل بھی تمام تر سماجی مسائل کا حصہ ہیں جسے افسانہ نگاروں نے الگ الگ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ناطق ے بہت سے افسانے بالواسطہ یا بلاواسطہ سماجی مسائل کا بیان ہیں جن میں اچھو بازی گر، بے چارگی، قائم دین، کمی بھائی، مومن والا کا سفر، معمار کے ہاتھ،

شریکا، حاجی ابراہیم وغیرہ اہم ہیں۔ ان افسانوں میں ناطق نے سماجی مسئلے بیان کرنے کے ساتھ ان مسائل کے معاشرے پر اثرات بھی قلمبند کیے ہیں۔

جدت:

ناطق کا افسانہ جدید افسانہ ہے اس نے افسانے میں بہت سے تجربات کیے ہیں۔ ناطق نے روایتی افسانے کو بدل کر نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ ناطق کا افسانہ مختصر اور جامع ہے۔ اسے ایک نشست میں پڑھا جا سکتا ہے اور اتنے مختصر افسانے کو اس قدر سادہ اور جامع لکھنا ناطق کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبات ہے۔ ناطق چونکہ شاعر بھی ہے اسے دریا کو کوزہ بند کرنا اچھے سے آتا ہے اس کا اثر اس کے افسانے میں بھی نظر آتا ہے کہ وہ تمام افسانے کو چند صفحات میں مکمل کر لیتا ہے مگر اس کی جامعیت کسی صورت کم نہیں ہونے دیتا۔ ناطق سادہ کہانی بیان کرتا ہے وہ روایتی داؤ پیچ نہیں کھیلتا اور کہانی بنتے ہوئے روایات اور افسانے کے مروجہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

ناطق کے افسانے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس نے افسانے کے اندر شعر اور گیت شامل کیے ہیں۔ افسانے کے ضمن میں یہ اجتہاد ہے اور ایک خوبصورت اضافہ بھی۔ ناطق سے پہلے کسی افسانہ نگار کے ہاں یہ روایت نہیں ملتی۔ مثال ملاحظہ کریں:

"شیر و چوڑی والا جو ہر واقعے کو منظوم کر دیتا تھا۔ اس نے گانا شروع کیا۔

دیکھی اج میں نے سگاں کی کمالاں

کالے کی دوڑاں چیتل کی چھالاں

جنگاں میں دیکھے ناں ایسے بہادر

موتاں، قضاواں کے لگ جاویں باڑر

سوراں تے گیدڑ، سہواں تے گوشاں

رہیاں ناں چیتل کو دیکھ کے ہوشاں" (۱۴)

ناطق کے افسانے "شہابو خلیفہ کا شک" سے یہ اقتباس پنجابی گیت کی شکل میں ناطق کی افسانوی زبان میں اجتہاد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس گیت میں تمام الفاظ پنجابی کے ہیں اور لہجہ بھی پنجابی ہے۔ افسانے ک اندر گیت اور اشعار ایک منفرد روایت ہے جسے ناطق نے بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ افسانے کے کردار کوئی گیت گاتے یا شعر پڑھتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکایات اور ضرب المثل کا استعمال بھی ناطق کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک قدیم روایت یہ بھی ہے کہ جب افسانہ نگار کوئی افسانہ شروع کرتا تھا تو اس سے پہلے ایک شعر لکھتا تھا، وہ شعر اس کا اپنا بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کوئی اور مشہور زمانہ شعر بھی لکھا جاتا تھا۔ قاسمی کے ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "چوپال" میں افسانے کے شروع میں ایک شعر درج ہے۔ بیدی نے بھی اپنے افسانے "لاجونتی" کے آغاز میں پنجابی شعر لکھا ہوا ہے مگر ناطق نے جس طرح افسانے کے اندر کہانی کے ساتھ ساتھ شاعری کو کہانی کا حصہ بنایا ہے اس طرح کسی دوسرے افسانہ نگار نے اتنی مہارت سے نظم و نثر کو ایک دوسرے میں جاندار طریقے سے ضم نہیں کیا کہ وہ ایک دوسرے کا حصہ معلوم ہونے لگیں۔ ایک اور مثال دیکھئے:

"ہال میں ایک سناٹے کا راج ہو گیا کہ اچانک چاچے جیرے کی آواز گونجی۔

سارو ماتا ایشری کرت نمو کئی بار

ہاتھ جوڑ کے عرض کراں لیو ہماری سار

اور پھر

آن کھڑے میدان وچ سورے، ہتھ وچ کمان تے بان پھڑ کے

لیاں پکڑ کٹاریاں جودھیاں نے، پے گرجدے وچ میدان کھڑ کے

ہنو وانگ للکاردے کھڑے سارے، سوربیر جو سیگھنے وانگ گھڑ کے

مارومار میدان دے وچ ہوئی، جانی چور ناگیا سی پھیر چڑھ کے

سارے ہوئی قتلام کشور چندا، سوربیر کھڑ و گئے کل اڑ کے "(۱۵)

ناطق نے اردو افسانے میں پنجابی شعر اور پنجابی گیت شامل کیے ہیں وہ ان کرداروں کو جاندار بناتے ہیں جو پنجابی ثقافت اور پنجابی مقامی کہانی کے کردار ہیں۔ ان کے افسانے "جیرے کی روانگی" میں ایک کردار "جیرا" جو قصہ گو ہے، قصہ بیان کرتے کرتے وہ منظوم قصہ سنانے لگتا ہے جس سے سننے والے لوگوں کی توجہ قصے میں زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

"پہلا ہتھ آن جانی تے اٹھایا۔۔۔۔۔چورٹے نے انگ آپڑا بچالیا
چینڑے للکارے اندر میدان دے۔۔۔کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
پھر جانی چورنا چلاوے سٹ نوں۔۔۔۔۔مار کے کٹاری کھولدا اے پھٹ نوں
ہو گئی ہے گرد موہرے آن بان دے۔۔کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان

دے
بھوندیاں پھرن اتے کل جوگناں۔۔۔۔۔اج راجپوتاں نوں پوے گا بھوگنا
اندر کھڑک کرن نہ میان دے۔۔۔۔۔کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
اکھاں وچوں چل گئے پرنالے رت دے۔۔۔۔۔اڈنے نے سیس جی سمان پت

دے
سورے گرج رہے سلطان دے۔۔۔۔۔کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان

دے
چھیڑا اٹھائی پھر دی ہے کالکا۔۔۔۔۔ہاندی گڑھ وچ چھڈ نائی ہالکا
چار پت مارے رحمت پٹھان دے۔کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان

دے"(۱۶)

قصہ گو اپنی طرز میں اشعار کی صورت قصہ آگے بڑھا رہا ہے اور افسانہ خود بخود آگے بڑھ رہا ہے۔ تمام کردار پنجابی ہیں اس لیے ان کی زبان بھی خالص پنجابی ہے۔

کردار نگاری:

ناطق کے افسانے کے کردار جاندار ہیں مگر ناطق کردار نگاری پر توجہ دینے کی بجائے کہانی پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ ناطق کے کردار کہانی آگے نہیں بڑھاتے بلکہ ان کی کہانی کرداروں کو لے کر چلتی ہے۔ افسانے میں یہ رویہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ کردار نگاری کی روایت بہت پرانی ہے اور بڑے بڑے مشہور و معروف افسانہ نگار کرداروں کو کہانی کا اصل قرار دیتے ہیں۔ مگر ناطق چونکہ روایت شکن افسانہ نگار ہیں اس لیے ناطق کے افسانے میں کردار سے زیادہ کہانی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ اپنی کتاب "نیااردوافسانہ" میں لکھتے ہیں:

> "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ واقعے کو کردار کا اظہار تصور کرنے کا نظریہ بیانیہ کا روایتی نظریہ نہیں ہے۔ یہ نظریہ بڑی حد تک بیانیہ کی روح کا استحصال کر دیتا ہے۔ اس کے بر خلاف ہمارے نئے افسانے جن میں کردار کی کوئی خاص اہمیت نہیں، بلکہ جن میں واقعہ ہی تقریباًسب کچھ ہوتا ہے، بیانیہ کی اصل روایت سے نزدیک تر ہیں۔ اور جب میں " نئے افسانے" کہتا ہوں تو میری مراد انتظار حسین کے افسانے نہیں، جن میں داستانی رنگ ہر ایک کو نظر آتا ہے۔ میری مراد آٹھویں اور نویں دہائی کے افسانے ہیں جن میں باقاعدہ پلاٹ چاہے نہ بھی ہو، لیکن ان مین واقعے کی کثرت ہے۔ روایتی بیانیے کی شان واقعات کی کثرت ہے، کردار نگاری نہیں۔"(۱۷)

ناطق کے ہاں کردار محدود ہیں۔ جبکہ کہانی یاد رکھنے والی ہے۔ کرداروں کے نام، ان کی زبان، لباس اور طرز زندگی کہانی کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ ناطق کی زیادہ تر کہانیاں دیہات کے اجڈ اور ان پڑھ طبقے کی کہانیاں ہیں اس لیے ان کے نام ،لباس، زبان اور بودوباش پنجابی دیہات کی ہے۔ ناطق کے افسانوں کے نام جو کرداروں کے نام سے ہیں:

اچھو بازی گر، قائم دین، شہابو خلیفہ کا شک، شیدے نے پگڑی باندھ لی، والٹر کا دوست، جیرے کی روانگی، شاہ محمد کا ٹانگہ، الہٰ دین کی چارپائی، حاجی ابراہیم شامل ہیں۔ ان تمام افسانوں میں جہاں کرداروں کے نام کے ساتھ ایک نفسیاتی تاثر قائم ہوتا ہے وہیں ان کرداروں کے اعمال اور واقعات و منظر کے ساتھ ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔

خواتین کردار

ناطق کے افسانے میں خواتین کی موجودگی اور کردار آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ کوئی عورت اگر کسی طرح کہانی میں شامل ہے تو وہ صرف کہانی کی اشد ضرورت کے تحت۔ ناطق کے دونوں افسانوی مجموعے جن میں کل ۲۹ افسانے شامل ان تمام افسانوں میں عورت کا کوئی بھی جاندار کردار نہیں ہے جس پر کہانی لکھی گئی ہو۔ حالانکہ دیہاتی معاشرت میں خواتین کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور دوسرے مسائل میں بھی ان کا کردار مضبوط ہوتا ہے مگر ناطق کے افسانے میں عورت اچھی یا بری کسی بھی صورت میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

البتہ ناطق کے افسانے میں کہیں کہیں ہم جنس پرستی کا بیان ملتا ہے:

"دوسرے لڑکے اچھل کود اور دھینگا مشتی میں مصروف تھے کہ اچانک اچھو اور اس کے چار پانچ چیلے ہم پر ٹوٹ پڑے، زبردستی ہمارا منہ چومنے لگے۔"(۱۸)

یہ ناطق کے پہلے مجموعے کے پہلے ہی افسانے "اچھو بازی گر" میں ناطق واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہانی بیان کر رہے ہیں۔

واحد متکلم

ناطق نے تقریباً ہر کہانی میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے، یا تو وہ کہانیاں اس کے سامنے وقوع پزیر ہوئی ہیں یا وہ خود ان کا حصہ ہے۔ ان میں بیشتر کہانیوں مین ناطق اپنے بچپن کا ذکر کرتا ہے۔

جیسے "شاہ مدار کی پازیبیں" میں ناطق نے لکھا ہے۔

"میں چونکہ ان کا پڑوسی تھا دیوار سے دیوار ملی تھی، اس لیے اکثر ادھر ہی رہتا تھا۔"

ایک اور افسانہ "شہابو خلیفیہ کا شک" میں لکھا ہے۔

"خیر یہ سب تو ایک طرف لیکن اگر سچ پوچھیں تو میں کہوں گا یہ مست کے کتوں کا واقعی جواب نہیں تھا، اس لیے کہ پچھلا شکار خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

افسانے "نرینہ اولاد" میں ناطق لکھتے ہیں۔

"بچے جن میں میں خود بھی شامل تھا نہ صرف اس پر آوازیں کستے بلکہ شدید نفرت بھی کرتے۔"

اس کے علاوہ، اچھو بازی گر، تابوت، والٹر کا دوست، کمی بھائی، مومن والا کا سفر ان تمام افسانوں میں ناطق خود موجود ہے اور یہ اس کی کہاناں ہیں۔ اس سلسلے میں سید وقار عظیم رقم طراز ہیں۔

" "میں" کے استعمال سے کہانی میں بالکل شروع ہی سے ایک انفرادی لہجہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی ہر بات میں ایک خاص زاویہ نظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور باتوں کے انداز میں ہر جگہ یقین اور سچائی نظر آتی ہے۔ مصنف کو بالکل شروع سے افسانے کی فنی ترتیب میں ایک طرح کا اطمینان اور سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ کہانی جیسے خود بخود اپنی ترتیب پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔"(۱۹)

افسانے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ افسانہ آپ کے ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ آس پاس چلتے پھرتے کردار اپنے اندر کہانیاں لیے ہوتے ہیں۔ ایک مصور یا تخلیق کار ان کرداروں کو جانچ کر ان کے اندر چھپی کہانی نکال لیتا ہے اور اسے الفاظ کے خوبصورت سانچے میں ڈھال کر افسانہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ ناطق بچپن سے ہی فطرت کے قریب ہے اس لیے ناطق کی ہر کہانی کا فطرت سے تعلق واضح دیکھا جاسکتا ہے۔

ناسٹیلجیا:

ناطق کی کہانیوں میں ناسٹیلجیا کا عنصر پایا جاتا ہے۔ بلکہ اکثر کہانیاں اس کے بچپن کی ہیں اور زیادہ تر کہانیوں میں ناطق خود موجود ہے۔ ماضی کی یادوں سے ناطق کا بہت گہرا تعلق ہے اور وہ یہ تعلق ختم کرنے کی بجائے اس کو اپنی کہانیوں کے ذریعے مزید پختہ کرتا چلا جاتا ہے۔ علی اکبر ناطق کے افسانے "اچھو بازی گر" میں وہ روایات کے تبدیل ہونے کی وجہ سے افسردہ ہیں:

"آہستہ آہستہ زمانہ آگے نکل گیا اب بچے بازی گروں کے تماشوں کی بجائے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لطف اندوز ہونے لگے۔ لوگوں نے بازی گروں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ وہ ہالی وڈ کے بہترین ایکشن دیکھ سکتے تھے۔ اس ماحول میں کوئی اچھو کی قلابازیوں پر کیا دھیان دیتا۔"(۲۰)

اردو افسانے میں ناسٹیلجیا کی روایت پرانی ہے۔ حجاب امتیاز علی کے ہاں بہت زیادہ ناسٹیلجیا پایا جاتا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے میں ماضی کی یادیں اور ناضی کے مسائل ملتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی آج میں ماضی کی دکھ اور ملامت بھی ناسٹیلجیا کا حصہ ہے۔ انتظار حسین کے افسانے میں ناسٹیلجیا نظر آتا ہے اور وہ اس کا براہ راست اظہار کسی کردار، کہانی، ڈائیلاگ یا واقعے کی صورت میں کرتے ہیں۔ صدیق احمد مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں بھی ناسٹیلجیا اک حد سے زیادہ پایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کئی افسانہ نگار ہیں جو اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی طرح ماضی کا دکھ بیان کرتے ہوئے آج کو کوستے ہیں۔ اس حوالے سے علی عباس جلالپوری اپنی کتاب "عام فکری مغالطے" میں رقم طراز ہیں:

"ہمارے زمانے کے بعض ارباب قلم اس فکری مغالطے سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ انسانی ترقی کا تصور ایک وہم باطل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، نوع انسانی کا حال مخدوش ہے اور مستقبل تاریک۔ محض اس لیے معاشرہ انسان کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی روایات کا احیاء کیا جائے۔ ہمارے لیے آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں، اس لیے پیچھے کی طرف ہٹنے کی کوشش کرنا چاہیئے تاکہ ہم اسلاف کی صف میں جا کھڑے ہوں۔

نفسیات کی زبان میں اسے " رگریشن " کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی
انسان کا ماضی اس کے حال سے اچھا تھا؟"(۲۱)

لی اکبر ناطق کی افسانہ نگاری کا ایک اہم پہلو ناسٹلجیا اور ماضی کی بازیافت ہے۔ ناطق کو اپنے ماضی سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ کسی صورت بھی اپنے آج سے ماضی کو جدا نہیں کر سکتے۔ ناطق اپنے ماضی سے مواد اکٹھا کر کے جدید افسانے میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناطق کے ہاں ماضی اور حال ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں۔ ناطق کو روایت اور اسلاف سے محبت ہے وہ پرانے گھر، عمارات، قصبے، کھیت کھلیان، پرانی ثقافت کے دلدادہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں یہ جا بجا ماضی سے محبت اور ناسٹلجیا دیکھنے کا ملتے ہیں:

"آج میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھ گئے اور جلد ہی وہاں جا کھڑا ہوا۔ اسے فوت ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ میں اس کے زمین بوس گھر کے سامنے اس تانگے کو دیکھ رہا ہوں، جس کے بمبو آدھے رہ گئے ہیں، پہیوں کو دیمک کھا چکی ہے اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر زمین میں دھنس چکے ہیں۔ سیٹیں اور لکڑی کی تختیاں کوئی نکال کے لے گیا ہے۔ وہ تانگہ ایک ایسا بد حال ڈھانچا ہے، جس کا نہ کوچوان موجود ہے اور نہ اسے کھینچنے والا گھوڑا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دیکھا، سکول سے نکل کر سیدھا اڈے کی طرف بھاگتا ہوا آیا ہوں اور شاہ محمد کے تانگے پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد شاہ محمد نے گھوڑے کو چابک لگائی، تانگے کو گاؤں جانے والی سڑک پر چڑھایا اور ایک نئی کہانی شروع کر دی۔"(۲۲)

ناطق ان تمام اقدار و روایات کے بدلنے پر خائف ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ ماضی کے چال چلن اور طور طریقے سادہ انداز زندگی فطرت سے قریب رہ کر انسانی بقاء اور سکون اور نفسیاتی مسائل کا حل، ان تمام عوامل کو ماضی سے جوڑ کر مشینی زندگی اور فطرت سے دوری ناطق کی زندگی اور اس کے افسانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

نئی مکمل تماشے:

ناطق کے افسانوں کی زبان اور کلچر ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے پنجابی گاؤں کی کہانیاں ہیں۔ چونکہ گاؤں کے لوگ میلے ٹھیلے اور کھیل تماشے کے شوقین ہوتے ہیں اور ان کی زندگی میں انٹرٹیمنٹ کا ذریعہ یہی چیزیں ہوتی ہیں تو یہ گاؤں کی معاشرت کا بنیادی حصہ ہیں۔ ناطق کا بچپن بھی گاؤں کی گلیوں اور میلوں ٹھیلوں میں گزرا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے میں یہ سب دیکھنے کو ملتا ہے۔ چونکہ معاشرتی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں اور ثقافت معدوم ہوتی چلی گئیں اور گاؤں کی زندگی اور بود و باش میں حد درجہ تبدیلی آگئی۔ مگر ناطق کو یہ تبدیلی کسی صورت پسند نہیں اور وہ اس بات کا ذکر اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں۔ کتوں کی لڑائی، مرغ لڑانا، چوپال پر کہانی سننا، تھڑے پر بیٹھے بزرگوں کی صحبت وغیرہ سے ناطق کا نفسیاتی اور جذباتی تعلق ہے۔ یہ تمام امور گاؤں کی خوشحال زندگی کی تصویر ہیں۔ جو ناطق کے افسانے میں اسی رنگ کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہیں:

> "سیالکوٹ سے پیر مست کی روانگی کی خبر کیا آئی، پورے علاقے میں میلے کا سماں بندھ گیا۔ پچھلے برس کا شکار لوگ کیسے بھول جاتے؟ نگاہوں میں پیر مست کے کتے اور ان کی طراریاں پھرنے لگیں۔ گھر آنگنوں اور چوراہوں میں کتوں کے تزکرے چھڑ گئے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، پیر مست کے کتے زیر بحث آئے۔ عصر کے بعد تو لڑکے بالوں سے لے کر بڑے بوڑھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ اسی ذکر سے روشن ہو جاتیں۔
>
> ایک بولا، میاں کتے کیا ہیں، چیتے ہیں چیتے۔ یوں ایک قدم اٹھا اور پندرہ گز سمیٹ لیے۔ دوسرے نے کہا، لو اور سنو، بھائی! وہ تو چلتی پھرتی موتیں ہیں۔ چیتا بچارا کیا جانے کہ شکار کیسے کرتے ہیں؟ پچھلے سال تو نے دیکھا نہیں؟ پیر مست کے "کالے" نے ٹیلے سے اترتے ہی خرگوش پر کیسی جھپٹ ماری۔"(۲۳)

یہ اقتباس ناطق کے پہلے افسانوی مجموعے "قائم دین" کو افسانے "شہابو خلیفہ کا شک" سے لیا گیا ہے۔ یہ پورا افسانہ گاؤں میں کتوں کی لڑائی اور شکار کھیلنے کے بارے میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام کرداروں کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات بھی

بیان کی گئی ہیں جو ان مشاغل کا حصہ ہیں۔ کس طرح سے پورا گاؤں اس ایک کھیل کو لے کر جذباتی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور شکار کھیلنے والے کتے اور ان کا مالک جس جس گاؤں سے گزرتے ہوئے آگے جاتے ہیں اس گاؤں کے تمام لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں کیونکہ ان کے لیے یہ صرف کھیل نہیں ہوتا بلکہ جینے مرنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اور جب کتا شکار کے دوران مر جاتا ہے تو گاؤں کے لوگ رونے لگتے ہیں اور اس قدر افسردہ ہوتے ہیں کہ کھیل چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور آخر میں کتوں کا مالک اس وجہ سے مر جاتا ہے کیونکہ اس کے دونوں کتے مر جاتے ہیں اور وہ اس بات کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانے میں گاؤں کے لوگوں کی وابستگی جن کھیلوں سے دکھائی گئی ہے وہ اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ مگر کسی وقت میں وہ دیہات اور گاؤں کا بنیادی عنصر تھا۔ ناطق اس تبدیلی سے خائف ہے اور اپنے افسانوں کے ذریعے اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کے دوسرے افسانوں میں بھی گاؤں کی ثقافت اور کھیل کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کے ایک اور افسانے "شاہ مدار کی پازیبیں" بھی اسی مزاج کا افسانہ ہے:

> "شاباش مونگیا شاباش، مار ایک چونچ اور، پھڑکا دے اسی جگہ دم کٹیے کو، واہ رے واہ وا، بہت ترے کی، مار ایک اور۔ ہا آآ، واہ بھئی واہ۔
> جوں جوں مرغوں کی لڑائی میں تیزی آتی گئی بابے چراغ دین کی آواز بلند ہونے لگی۔ سینکڑوں آدمی ہوں گے کہ ارد گرد جگمگتا تھا۔ ہر چونچ کی ضرب پر داد کے ڈونگرے برستے، ارو واہ، شاباش، کاٹ دے کلغی، پھاڑ دے پوٹا کی آوازیں کان بہرے کیے دے رہی تھیں۔
> ادھر شریف لٹھ باز نے جب مرغ کو پٹتے دیکھا تو تماشائیوں کے ساتھ اپنے مرغ کو بھی کوسنے لگا۔ او حرام کے پٹھے، گھر پھونک دیا تیرے باداموں کے عوض۔ بیوی میکے بھیج دی اور تو نے منہ کالا کرا دیا۔ ہت تیرے حرام خور کی۔ اللہ قسم آج ذبح کر کے نہ کھایا تو شریفا لٹھ باز نہیں۔ لیکن مرگ نہ اٹھا۔ جب چونچوں پہ چونچیں کھانے لگا تو بابا چراغ دین نے آگے بڑھ کر اپنا مونگیا پکڑ لیا، جس کی اپنی کلغی بھی خون میں نہا رہی تھی۔ اچھے نے شریفے کو دلاسا دیا اور

اس کا مرغ اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا، جسے لے کر وہ چپکے سے نکل
گیا۔"(۲۴)

ناطق کا یہ افسانہ شاہ مدار کی پازیبیں بھی اپنی نوعیت کا ایک الگ افسانہ ہے۔ جس مین ناطق نے گاؤں کے کھیل اور انٹرٹینمنٹ بیان کرتے ہوئے مرغ لڑانے کا واقعی بیان کیا ہے۔ افسانے میں چراغ دین کے گھر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کہ مرغ لڑاتا ہے اس کے بچے بھی اسی کام میں ماہر ہیں اور پورے گاؤں مین ان کے ڈنکے بجتے ہیں۔ سارا گھر ہی اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کبوتر پالنا، تیتر بٹیر لڑانا اور سارا سارا دن ان کی خدمت کرنا ہی ان کا دین دھرم تھا۔ جو کچھ اچھا کھانے کو ہاتھ لگتا تو وہ اپنے مرغ اور کبوتروں کو کھلا دیتے۔ اور لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتے کہ ان کے مرغ بادام کھاتے ہیں۔ پورا گاؤں ان باپ بیٹوں لا دوست تھا۔ نہایت خوش مزاج اور مطمئین لوگ تھے کہ ان کی زندگی بس کبوتر تیتر مرغ میں ہی کٹ رہی تھی۔ پھر ایک بیٹے کو چوھدری اپنے ساتھ لندن نوکری چاکری کے لیے لے جاتا ہے اور معقول تنخواہ مقرر کرتا ہے ادھر سارے کا سارا گھر نئے خواب دیکھنے لگ جاتا ہے کہ پیسے آنے والے ہیں مگر ان کی خواہشات وہی ہوتی ہیں کہ پیسے آئیں گے تو نئے کبوتر لیے جائیں گے۔ اور باپ نے خواہش ظاہر کی کہ بیٹا پیسے بھیجے گا تو ان پیسوں سے اپنے مرغ شاہ مدار کی پانچ تولے سونے کی پازیبیں بنوائی جائیں گی۔ اور کچھ پیسے ملنے پر کبوتر، مرغ کا میلہ سجادیا جاتا ہے مگر وہ بیٹا نوکری چھوڑ کر میلے کے دن واپس گاؤں آجاتا ہے تاکہ مرغ اور کبوتر کے تماشے میں حصہ لے سکے۔ یوں باپ کا اپنے مرغ کیلئے سونے کی پازیبیں بنوانے کا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ اس افسانے میں ناطق نے نفسیاتی کردار اور ان کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے ایک کھیل کے ذریعے پیش کیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا مزاج آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ ناطق نے افسانے کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ انسان کی خصلت کبھی نہیں بدل سکتی۔ وقت اور حالات بدل جاتے ہیں مگر انسان وہی رہتا ہے۔ ناطق نے افسانے کے ذریعے معاشرتی رویہ بڑی چابکدستی سے بیان کیا۔ کیونکہ افسانے کے کردار ایک معاشرتی رویے اور سوچ کے عکاس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الرحمن اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں افسانے کے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چنانچہ افسانے کے دیگر کرداروں سے ابھرتا معنی تعلقات و اقدار کے جاتے
ہیں اور واقعات کے ضمن میں مخصوص رد عمل ہوتا ہے لیکن یہی کردار جب
قاری کے سامنے آتا ہے تو افسانہ میں مخصوص کردار و اعمال تبدیل ہوتے ہیں وہ
معاشرہ کے اجتماعی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے کبھی ان کی ترجمانی کرتا ہے تو
کبھی ان کے خلاف رد عمل کا ایک انداز قرار پاتا ہے۔ کبھی اجتماعی صورتحال کا
اشاریہ بنتا ہے، کبھی روح عصر کا استعارہ تو کبھی ناگفتنی کی علامت اور اسی سے
افسانہ میں وہ گہری معنویت جنم لیتی ہے جس کے نتیجہ میں افسانہ اپنے عصر سے
بلند ہو کر ہر عہد کے لیے بامعنی ثابت ہوتا ہے۔"(۲۵)

ناطق کے افسانے کے کردار بھی ایک کردار کی کی سطح سے اوپر اٹھ کر معاشرتی اور سماجی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام کردار کہانی کے ساتھ چلتے ہیں اس لیے ناطق روایتی کردار نگاری کا قائل نہیں ہے۔

مذہبی رنگ:

ناطق کے افسانے تمام سماجی پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ مذہب اور معاشرت ہر سماج کا بنیادی عنصر ہیں۔ جو انسان کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک ساتھ رہتے ہیں۔ اس لیے ناطق کے افسانے میں مذہب کا عنصر ایک الگ جامعیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کے ایک افسانے "معمار کے ہاتھ" میں وہ مذہبی سماجی رویے بیان کرتے ہیں۔

"جناب عالی میری آنکھوں کے سامنے اس بد بخت نے شریف نمازی کے
جوتے چرائے ہیں۔ یہ دونوں عادل گواہ اور ان کے علاوہ دوسرے بھی کئی لوگ
موقع پر موجود تھے۔ چوکیدار شرعی عدالت میں گواہی دیتے ہوئے بولا۔
چوکیدار کے بعد شاہدین نے باری باری گواہی دی۔
لیکن ملزم کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے۔ قاضی نے ترجمان کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا۔
کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم نے جوتے نہیں چرائے؟ ترجمان نے
اسے زور دے کر پوچھا۔

گت ترجمان کے تین بار پوچھنے پر بھی وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ دراصل اسے
کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کانوں میں فقط سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ بلکہ
اسے اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کو یہاں کس لیے لایا گیا ہے؟
ملزم کی خاموشی اور خستگی کی وجہ سے قاضی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک عادی مجرم
اور پیشہ ور چور ہے۔ بالآخر عدل اور شرعی قانون کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے
قاضی نے اپنا فیصلہ سنا دیا جسے مجرم کے علاوہ تمام لوگوں نے سنا اور تحسین کیا۔
صبح کی اذان کے بعد جب اسے ہاتھ کاٹنے کے لیے بند خانے سے باہر لایا گیا تو وہ
یہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک ماہر کاری گر ہے۔ حتیٰ کہ اسے اپنے بوڑھے باپ کی
شکل بھی یاد نہ رہی تھی۔"(۲٦)

ناطق نے اس افسانے میں ایک مذہبی سماجی رویہ بیان کیا ہے کہ کس طرح مذہب کی آڑ میں معاشرہ اپنے ذہنی و قلبی انتشارات چھپا دیتا ہے۔ مذہب کو لوگ صرف اپنے فائدے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ کس طرح انسان مذہب کی سرپرستی میں بے حال و بے کس زندگی گزار رہا ہے۔ ناطق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جز سے کل کی بات کرنا جانتے ہیں۔ ناطق کے ایک اور افسانے " مولوی کی کرامت " میں ایک اور مذہبی رویے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"خیر یہ ایسے واقعات نہیں تھے جو مولوی عبد الرحمن کے لیے کسی خرابی کا
باعث بنتے اور قصبے والون کو بدگمان کرتے۔ ویسے بھی قصبے کی زیادہ آبادی
نظریاتی سطح پر مولانا کی موافق تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو تنظیموں کے ساتھ جو
تعلق تھا اس کا علم بھی قصبے والوں کو خوب تھا۔ قربانی کی کھالیں اور سالانہ
چندے مولوی صاحب ان کے لیے اکٹھا کرتے تھے۔ ایک دو لوگوں نے ایک
دفعہ چندہ نہ دے کر کفر کا ارتکاب بھی کیا مگر جلد ہی جہادی تنظیموں زور بازو اور
مولانا کی نصیحت نے انہیں صراط مستقیم پر دوبارہ لا کھڑا کیا۔"(۲۷)

ناطق نے اس افسانے میں روایتی مذہبی رویے پر طنز کرتے ہوئے وہ تلخ حقیقت بیان کی ہے کہ اس کا تعلق کسی ایک معاشرے یا کردار سے نہیں بلکہ یہ ایک سماجی رویہ ہے جسے تبدیل کرنے یا برا سمجھنے والے کو بھی مذہبی شدت پسندوں کی

نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے سنگین نتائج ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ایک سماجی المیہ ہے کہ مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

خاتمہ:

علی اکبر ناطق کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بطور افسانہ نگار ناطق نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے افسانے میں بیان کیا۔ ناطق ایک بے باک تخلیق کار ہے وہ اپنے موضوع اور واقعے پر مکمل گرفت رکھتا ہے کہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ خود اس واقعے کا حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنا افسانہ یا شاہکار لکھتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی آنکھوں دیکھی کہانی ہو یا اس کی زندگی کی کہانی ہو۔ مگر اس کو بیان کرنے کا سلیقہ اسے مکمل کہانی بناتا ہے کبھی کبھی تو قاری بھی اپنے آپ کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ناطق کے افسانے میں کہانی آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ قاری بڑے انہماک سے کہانی میں محو ہو کر رہتا ہے اور اختتام کے لیے متجسس ہوتا ہے۔ یہی بات ناطق کو ایک بڑا افسانہ نگار بناتی ہے۔ نقاد یا تنقید نگار ناطق کے افسانے پر جو تنقید کرتے ہیں وہ ادبی حوالے سے شاید ٹھیک ہوں مگر کہانی ایک قاری کے لیے لکھی جاتی ہے نہ کہ نقادوں کے لیے۔ اور ناطق اپنے قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ناطق کے افسانوی مجموعے کے چار چار ایڈیشن شائع ہونا ہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسری بات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

ناطق کے افسانوں کا ترجمہ دیگر کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان میں ان کے افسانوں کا ترجمے "پینگوئن" اور "آکسفورڈ" کی طرف سے چھپ چکے ہیں۔ اور یہ ایک اعزاز ہے کیونکہ ادبی دنیا میں ان اداروں کا نام اور کام کسی سند سے کم حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہندی مین بھی ناطق کے افسانوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹی میں ناطق کے افسانوں کا پنجابی ترجمہ پڑھایا جا رہا ہے۔ چندی گڑھ سے ان کے افسانوں کا ترجمہ پنجابی میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی کچھ یونیورسٹیوں میں اردو کے نصاب میں ان کے افسانے پڑھائے جا رہے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں اتنی شہرت اور پسندیدگی اور اعزازات کسی تخلیق کار کے حصے میں نہیں آئے جتنے علی اکبر ناطق کے حصے آئے ہیں۔ اردو ادب کے

بڑے نقاد اور ادب کو سمجھنے والے لوگ ناطق کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ ناطق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہی تمام ناقدین ادب کی توجہ حاصل کرنے مین کامیاب ہو چکا تھا اس کے بعد دوسرا مجموعہ اس میں اضافی ثابت ہوا کیونکہ کسی تخلیق کار کے لیے اپنا معیار بر قرار رکھنا مشکل ہوتا ہے کہ لوگ اس سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ نا صرف قاری بلکہ نقاد بھی اس تخلیق کار سے اس کی پہلی ہی تخلیق کے بعد اس کا معیار متعین کر لیتے ہیں اور پھیر تخلیق کار کے لیے اسے بر قرار رکھنا تھوڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر علی اکبر ناطق ان تخلیق کاروں میں سے ہے جس نے اپنے پہلے مجموعے سے نقادوں اور قاری کو چونکا دیا مگر اس سے زیادہ توجہ اس وقت حاصل کی جب ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا اور ان کا معیار مزید بلند ہو گیا۔

انتظار حسین جن کو اردو افسانے کا ایک عہد کہا جاتا ہے انہوں نے بھی علی اکبر ناطق کے افسانے کی تعریف کی اور "دی ڈان" اخبار میں ناطق پر ایک آرٹیکل بھی لکھا۔

مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی نے بھی علی اکبر ناطق کے بارے مضمون لکھا۔ اور ان کی بیٹی "افشاں فاروقی" نے بھی ناطق کی تخلیقات پر مضمون لکھا۔ دیگر بے شمار ادبی لوگوں نے ناطق پر کالم، مضمون اور آرٹیکل لکھے جو مشہور ادبی رسالوں اور اخباروں میں چھپے۔ انگریزہ اخباروں "دی ڈان" اور "دی نیوز" وغیرہ میں ناطق کی شاعری، افسانے، ناول پر بے شمار مضمون چھپ چکے ہیں۔

دور حاضر کے مشہور و معروف نقاد شمس الرحمن فاروقی نے ناطق کی ایک کتاب کا دیباچہ بھی لکھا۔ جس میں انہوں نے ناطق کے افسانوں کے بارے میں لکھا۔:

> "علی اکبر ناطق کو ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے مگر انہوں نے تقریباً سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی ہے۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے افسانے پنجاب کی زمین اور تہذیب سے غیر معمولی دلچسپی اور ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر افسانہ نگار کی نثر، مکالمہ، اور بیانیہ کے نامانوس

گوشوں پر بھی ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا ہر صفحے پر خود انسان
اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش
کے نکات سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔"(۲۸)

علی اکبر ناطق کے افسانوں میں ایسی برجستگی ملتی ہے جو اسے اس عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ علی اکبر ناطق کے بے باک رویے کا عکس ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے جملے کاٹ دار اور مکالمے تیکھے ہوتے ہیں۔ ناطق ایسے پورے افسانے کی بات ایک لائن میں کر جاتے ہیں۔ ناطق کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد اپنی کتاب "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" میں ناطق کو صف شکن کہتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"علی اکبر ناطق کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ برجستہ مکالمے لکھتے ہیں
اور ڈرامائی واقعات خاص طور پر انجام وضع کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ
فسانہء آزاد کے صف شکن بٹیر کے فضائل بیان کرنے والے مصاحب کو بڑی
شوخی کے ساتھ پنجاب کے گاؤں میں پیدا کر دیتا ہے۔ اب ان کی تاریخ کا مرکز
یا ان کی تحریک کا محور مرغا بھی ہے اور کتا بھی اور اس کے ساتھ ساتھ قبریں بنا
کر عرس کو سوداگری سے جوڑنے والے معصوم اور چالاک کردار بھی اسی
طرح تخلیق کرتا ہے کہ اس کے افسانے پنجاب کے اجتماعی معاشرت کے زیادہ
قریب آجاتے ہیں۔"(۲۹)

علی اکبر ناطق کے فن پر جتنی بات کی جائے اتنی کم ہے۔ انکے افسانے پر ملکی و غیر ملکی نقاد تفصیل سے بات کر چکے ہیں۔ بہت سے پاکستانی نقاد ناطق کے خلاف لکھ کر مشہور ہونے کی کوشش بھی کر چکے ہیں۔ مگر وہ کسی صورت میں ناطق کو ادبی قارئین کے دل سے نہ نکال سکے اور ناطق کی پزیرائی پسندیدگی گزرتے دنوں کے ساتھ مزید بڑھ رہی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ احمد دہلوی، سید (۱۹۸۷) فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ص ۱۸۶

۲۔ وقار عظیم، سید (۱۹۹۱) داستان سے افسانے تک (مرتب: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد)، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۹۱

۳۔ شیریں، ممتاز (۱۹۶۳) معیار، لاہور، نیا ادارہ، ص ۹۳۔ ۹۴

۴۔ سندھیلوی، سلام (۱۹۶۴) ادب انتقیدی مطالعہ، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ص ۱۶۲

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر (۱۹۷۲) نئے مقالات، سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، ص ۱۶۵

۶۔ احمد فیض، فیض (۱۹۹۰) ہمارے افسانے، مشمولہ (مقالات فیض) لاہور، پیروز سنز، ص ۵۳

۷۔ منظر، شہزاد (۱۹۸۲) جدید اردو افسانہ، کراچی، منظر پبلی کیشنز، ص ۶۹

۸۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۷) شاہ محمد کا ٹانگہ، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۰

۹۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۰۶

۱۰۔ قاسمی، احمد ندیم (س ن) اردو افسانے کے مسائل، لاہور، نقوش شمارہ، ص ۱۱۰

۱۱۔ آغا، وزیر (۱۹۸۶) دائرے اور لکیریں، لاہور، مکتبہ خیال، ص ۱۴۳۔۱۴۵

۱۲۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۲۰

۱۳۔ شکیل احمد، ڈاکٹر (۱۹۸۴) اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، اعظم گڑھ، شوکت علی در العلوم روڈ، ص ۲۷۶

۱۴۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۸۷

۱۵۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۷) شاہ محمد کا ٹانگہ، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۷۔ نارنگ، گوپی چند (۲۰۱۰) نیا اردو افسانہ، دہلی، اردو اکادمی، ص ۲۶

۱۸۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۰

۱۹۔ وقار عظیم، سید (۱۹۶۱) فن افسانہ نگاری، لاہور، اردو مرکز، ص ۳۰۰۔۳۰۱

۲۰۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۲

۲۱۔ جلالپوری، علی عباس (۲۰۱۳) عام فکری مغالطے، لاہور، زاہد بشیر پرنٹرز، ص ۳۵

۲۲۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۷) شاہ محمد کا ٹانگہ، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۴۷

۲۳۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۸۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۴

۲۵۔ اختر، سلیم(۲۰۰۹)اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۵۰۴

۲۶۔ ناطق، علی اکبر(۲۰۱۸)قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۶۲، ۶۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۸۔ ناطق، علی اکبر(۲۰۱۹)، ریشم بُننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۳

۲۹۔ احمد، انوار(۲۰۱۶)اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ملتان، کتاب نگر، ص ۲۲۶

ناطق کی ناول نگاری

نولکھی کوٹھی

علی اکبر ناطق کا اکلوتا ناول "نولکھی کوٹھی" ۲۰۱۴ میں سانجھ پبلیکیشنز سے شائع ہوا۔ یہ ناول ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ۵۶ حصوں (اقساط) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب علی اکبر ناطق نے اپنے اباجی "محمد بشیر" کے نام کیا ہے۔ اس ناول کے اب تک سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کا دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ناول کی روایت:

ناول اطالوی زبان کے لفظ "ناولا" سے نکلا ہے۔ ناولا کے معنی نیا کے ہیں۔ لغت میں ناول کے معنی "نادر"، "نئی بات" نئی چیز کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں ناول سے مراد "ایک قصہ کہانی جس میں ایک پوری زندگی بیان کی جائے" ہے۔ ناول کو ایک خاص طوالت کا نثری قصہ کہا جاتا ہے۔

> "ناول میں چونکہ انسان کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔اور اس کے ارد گرد واقعات کا تانا بانا بنا جاتا ہے اور سب کے تعلق سے زندگی کی معنویت اور اس کی داخلی قوتوں اور خارجی رشتوں نیز کائینات کی دیگر حقیقت کی تلاش کی جاتی ہے۔ اس لیے اکثر ناول کو، ناول آف کریکٹر، کہا جاتا ہے۔"(۱)

بنیادہ طور پر ناول ادب کی ایک صنف ہے جس میں ایک مکمل کہانی تمام اجزائے ترکیبی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ اس کے کچھ عناصر متعین کیے جا چکے ہیں۔ ناول کے عناصر ترکیبی درج ذیل ہیں:

۱۔ کہانی

۲۔ پلاٹ

۳۔ واقعہ

۴۔ کردار

۵۔ زمان و مکاں

۶۔ اسلوب

۷۔ نقطہ نظر

ڈاکٹر احسن فاروقی ناول کے عناصر ترکیبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پلاٹ بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بت تراش کچھ خاص فنی قاعدے کے موافق کسی پتھر کی سل کو تراش کر ایک خوش نما بت بنائے مگر خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ کا اثر نہ ہو جیسے کسی بت تراش سے بت کا اصل سے مطابق ہونا ضروری ہے ویسے ہی پلاٹ کا اسی اصل قصہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسے بت تراشے ہوئے بت میں حقیقت کے ساتھ حسن یا دلکشی ضروری ہے ویسے ہی ناول کے پلاٹ میں ایک فنی حسن و خوبی کا وجود لازم ہے۔ الغرض پلاٹ کی بناوٹ جتنی زیادہ دلکش ہو گی اتنا ہی پلاٹ اچھا ہو گا۔"(۲)

ناول وہ صنف سخن ہے جس میں ذیادہ سے ذیادہ واقعات، خیالات، جذبات اور ثقافت کو حصہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ ناول طویل ہوتا ہے اور اس کی کوکھ میں تمام عوامل سما جاتے ہیں۔ ناول کسی تخلیق کار کی کل تخلیقی قوت کا امتحان ہوتا ہے کیونکہ یہ تکنیکی حوالے سے مشکل صنف ہے۔ شاعری کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ہے۔

"ناول نویس اپنی خواہش کے مطابق کوئی نئی دنیا نہیں بناتا، وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے۔ یہی جس میں دکھ بھی ہے سکھ بھی، جنگ بھی ہے صلح بھی، موت بھی ہے پیدائش بھی، پونجی پتی بھی ہے اور مزدور بھی، شہنشاہ بھی ہے اور غلام بھی۔ لیکن شاعر اس عالم کو پس پشت ڈال کر تخیل سے تخلیق کا کام لے سکتا ہے۔۔۔۔۔ جبکہ ناول نگار کو اس کے برعکس ہر وقت اسی دنیا کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔"(۳)

سماجی، نفسیاتی، معاشی، مذہبی، سیاسی خواہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو ناول میں اس کا مکمل کر اظہار کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کی طرح ناول بھی انگریزی کی وساطت سے اردو میں آیا ہے۔ ناول داستان کی ہی ترقی یافتہ قسم ہے۔ قدیم زمانے میں داستانوں

کا عروج تھا اور جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا ادب میں بھی ترقی کی اشکال سامنے آئیں۔ داستان چونکہ کافی طویل ہوتی ہے اور اس کے لیے کئی نشستیں درکار ہوتی ہیں۔ جب کہ ناول اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ داستان کو مختصر کر کے اس میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کے بعد ناول وجود میں آیا۔ اردو ناول کی عمر دوسرے اصناف ادب سے کم ہے۔ مگر ناول نے اپنا راستہ آہستہ آہستہ طے کیا۔ اس میں مختلف رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق تمکین اردو ناول کے رجحانات کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> " بہر حال اردو ادب ایک ساگر ہے جو بے شمار رجحانات اور خیالات سے مل کر بنا ہے۔ ناول اور اس کا فن بھی اسی سمندر کا حصہ ہے جس نے فنی ارتقاء کا سفر ۱۸۵۷ کے ہنگامے کے ساتھ شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔ اب تک کے اس سفر کے دوران اردو ناول کو نہ صرف فنی و جمالیاتی پہلوؤں سے آشنائی ہوئی بلکہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حرکات اور ماحول سے بھی گزرنا پڑا۔ "(۴)

اردو ناول کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے۔ ان کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ۱۹۶۹ میں شائع ہوا۔ نذیر احمد کا ناول فنی حوالے سے خاص اہمیت نہیں رکھتا مگر وہ اردو کا پہلا ناول گردانا جاتا ہے۔ نذیر احمد نے اصلاحی اسلوب اختیار کیا اور وہ ناول کو سماجی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے "بنات النعش" "ابن الوقت" "توبۃ النصوح" لکھ کر ناول کو باقاعدہ اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ان کے بعد دوسرے اہم ناول نگار رتن ناتھ سرشار ہیں۔ سرشار نے "فسانہ آزاد" لکھ کر اردو کو یک شاہکار ناول کا تحفہ دیا۔ ان کا یہ ناول ۱۸۷۹ میں شائع ہوا۔ ایک اور ناول "فردوس بریں" بھی سرشار کا ایک عمدہ ناول ہے جو ۱۹۹۹ میں لکھا گیا۔ سرشار نے بھی اصلاحی ناول لکھے مگر ان سے اردو ناول کی خالی جھولی بھرتی گئی۔ ان کے بعد آنے والے ناول نگاروں نے ناول کا رنگ بدلا اور ناول کو اصلاح سے مزاح کی طرف لے گئے۔ جن میں سجاد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے مشہور ناولوں میں "میٹھی چھری" "حاجی بغلول" اور احمق الدین وغیرہ شامل ہیں۔ ان مزاحیہ ناولوں سے پہلے ناول پر اصلاح کی چھاپ لگ چکی تھی۔ مگر سجاد حسین کے ناولوں کے بعد دیگر ناول نگار اس طرف متوجہ ہوئے اور ناول کو مکمل صنف کے طور پر لینے لگے کہ جس میں ہر موضوع شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے مرزا رسوا نے ایک ایسا شاہکار ناول لکھا جسے آج تک ناول نگر اپنے لیے مشعل راہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا ناول "امراؤ جان ادا"

اردو ناول کی تاریخ کا ایک اہم ناول ہے کیونکہ رسوا نے ناول کا رنگ ڈھنگ بدل کر رکھ دیا اور ناول میں پہلی بار حقیقت نگاری کو اپنایا۔ ان کے بعد دیگر بہت سے ناول نگار ہیں جنہوں نے ناول کو ایک الگ مقام پر پہنچایا۔ جن میں راشد الخیری، عبدالحلیم شرر، سجاد ظہیر، کرشن چندر، پریم چند، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ، شمس الرحمن فاروقی، مرزا حامد بیگ وغیرہ اہم نام ہیں۔

اردو ناول اپنی ترقی کے ے ساتھ ساتھ عروج وزوال کی منزلیں طے کرتا ہوا جدید ناول کی طرف گامزن ہے۔ مگر جس طرح اردو کے دیگر تما اصناف کو اہمیت ملی اس طرح ناول کو وہ اہمیت اور مقام نہیں ملا۔ ڈاکٹر سلیم الرحمن اردو ناول کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگر ناول سے مرراد کوئی بھی طویل کہانی، واقعات کا تانا بانا، تھوڑی سی منظر نگاری اور کچھ مکالمہ نگاری ہو تو یقیناً اردو میں بے شمار ناول مل جاتے ہیں۔ اگر ناول سے مراد ایسی تحریر ہے جو شعور زیست کے ساتھ ساتھ شعار زیست بھی دے جو کرداروں کے حوالہ سے انسانی سائیکی کا لینڈ سکیپ منور کرے، جو وقوعات کے محرک بننے والے عوامل کی نشاندہی کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اور انسانی سماج کا پیرا اسکوپک مطالعہ پیش کرے۔ اگر یہ خصوصیات ناول کے لوازم میں شامل ہیں تو پھر واقعی ہمارے ہاں بہترین ناولوں کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ ہمارے ناول میں کہانی بھی ملتی ہے اور کردار بھی، مناظر بھی ہوتے ہیں اور جذباتی مکالمے بھی لیکن ان سب کے امتزاج سے وہ گیسٹالٹ نہیں بنتا جو قاری میں ترفع پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔"(۵)

نولکھی کوٹھی:

علی اکبر ناطق کا ناول نو لکھی کوٹھی تقسیم کے موضوع پر ایک نیا ناول ہے اس سے پہلے اردو میں ہمیں اس موضوع پر بے شمار ناول ملتے ہیں اور ہر ناول نگار کا اپنا الگ انداز بیان اور واقعات کو دیکھنے کا سلیقہ بھی جدا جدا ہے۔ علی اکبر ناطق ان تخلیق کاروں میں شامل ہیں جو تقسیم سے خائف نظر آتے ہیں۔ نو لکھی کوٹھی ایک انگریز آفیسر "ولیم" کی کہانی ہے جو کہ ہندوستان میں انگریزوں کی کئی سالہ حکومت اور اس کے بعد تقسیم کے گرد گھومتی ہے۔ اس لحاظ سے اسے تاریخی ناول کہا جا سکتا ہے۔ علی عباس حسینی اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> "ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادہ اور خاموش ہوں یا
> امتداد زمانہ کی وجہ سے جو واقعات صاف دکھائی نہیں دیتے یا جو تحصیلیں
> دھندلی پڑ گئی ہیں۔ انہیں قصے افسانے واضح کر کے دکھاتے ہیں۔"(۲)

علی اکبر ناطق کے ناول کی کہانی کا مرکز اوکاڑہ میں واقع ایک کوٹھی ہے جو کہ کہانی کے مرکزی کردار "ولیم" کو وراثت میں ملی ہے۔

کہانی:

ناول کی کہانی جتنی سادہ ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی ہے۔ کہانی کے شروع میں قاری کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کہانی تقسیم کی کہانی ہے۔ یہ دو سرداروں کی لڑائی کی کہانی تھی جو کہ آگے جا کر تقسیم کی کہانی میں بدل جاتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ولیم جو اس نو لکھی کوٹھی کا مالک ہے۔ ولیم تقسیم کے بعد پاکستان میں آ جاتا ہے اور خود کو ہندوستانی کہتا ہے مگر چونکہ وہ انگریز ہے تو اس کو کوئی قبول نہیں کرتا اور کسی صورت اسے ہندوستانی نہیں مانا جاتا۔ نو لکھی کوٹھی اس حصے میں تھی جو حصہ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ مگر پاکستان کے مسلمان ولیم کو پاکستانی نہیں مانتے اور اس کو ساتھ ہتک آمیز رویہ رکھتے ہیں۔ اس ناول کی کہانی بیسویں صدی کے تقریباً ۵۰ سے ۶۰ سال کی کہانی ہے جس میں پنجاب کے مختلف علاقوں کی ثقافت، رہن سہن، مذہب، معاشی حالات، جاگیردارانہ نظام، ملکی و غیر ملکی سازشیں اور تقسیم کے دوران اور بعد میں ہونے والی تبدیلیاں اور مظالم کہ جن کا مداوی ممکن نہیں بیان کیا گیا ہے۔ ولیم جو انگریز ہے اور پاکستان میں اپنی وراثتی کوٹھی سے محبت کرتا ہے اور اسی جگہ رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اسی سرزمین پر مرنے کا خواہش مند ہے۔ جیسے کہ باقی تمام لوگ اپنے وطن سے عقیدت

کہانی کے شروع میں غلام حیدر اور سودھا سنگھ کی دشمنی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اور قاری ان دونوں کی کہانی میں مگن ہوتا ہے انہیں ہی کہانی کا مرکزی کردار تصور کرتا ہے مگر کہانی میں ولیم جو کہ ایک انگریز ہے اور اس سرزمین کو اپنا وطن مانتا ہے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ شروع میں ولیم پر قاری کی اتنی توجہ نہیں جاتی مگر جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے ولیم کا کردار مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ پھر سودھا سنگھ کا انجام ہوتا ہے۔ غلام حیدر جو کہ اس ناول کا اہم کردار ہے وہ تقسیم ہند کے وقت فسادات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مگر ولیم آخر تک ایک جاندار کردار ہے وہ اسی مٹی کا حصہ بن جاتا ہے اور یوں اس کا اختتام ہوتا ہے۔ ناطق کے بقول اس ناول کے بہت سے کردار اصل زندگی کے کردار ہیں اور اپنے اصل نام سے ناول میں شامل ہیں۔ جیسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، محمد علی جناح، نواب افتخار ممدوٹ، اور ناول کے آخر میں علی اکبر ناطق خود بھی ناول میں موجود ہیں۔

> "آج میں پھر ان ٹھنڈی ہواؤں کا لطف لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس طرف بڑھ رہا تھا، مگر جیسے ہی اس کوٹھی پر پہنچا وہاں اور ہی رنگ تھے۔ مصلیوں کے بچے صحن میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ذرا غور کیا، تو پتا چلا وہاں کوئی اور ہی خاندان آباد ہے۔ میں نے جائزہ لینے کے لیے بھرپور نظر ماری لیکن مجھے ولیم نظر نہ آیا۔ بالا آخر انہیں میں سے ایک آدمی سے پوچھا،
> یہاں ایک بوڑھا انگریز تھا، وہ کہاں ہے؟
> اس نے انتہائی لاپرواہی سے جواب دیا، کاکا اسے تو فوت ہوئے بھی ہفتہ ہو گیا۔ پنج چک کے عیسائی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں، وہیں کے گرجاگھر میں اس کی قبر ہے۔" (۷)

نفسیاتی کردار:

علی اکبر ناطق اپنے ناول کے کرداروں کی نفسیات اس قدر جزیات سے لکھتا ہے کہ وہ اصل زندگی کے کردار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناول میں تمام کردار اپنی جگہ خود بناتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کرداروں کے ذریعے پورے معاشرے کی نفسیات عیاں ہوتی ہے جیسے کہ انگریز افسروں کے کردار اور ان کی نفسیاتی کشمکش سے ناطق نے ان کے عمومی رویے بیان

کیے ہیں۔ سکھ معاشرت کا بیان اور کردار اس سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک ایک جز کی ہو بہ ہو تصویر اتاری ہے۔ مسلمان کرداروں کی نفسیاتی حقیقت سے پردہ اٹھایا اور ان کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کردار جیسے ہماری گلی کے لوگ ہوں ہمارے ارد گرد رہتے ہوئے ہزاروں لوگ اسی قماش کے ہیں۔ ناطق کے ایک ایک کردار نے اپنے اپنے پورے معاشرے کی نمائیندگی کی ہے۔ ناطق نے جزسے کل کا کام لیا ہے اور وہ اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایک کتاب "کردار اور کردار نگاری" میں کسی فن پارے کے کرداروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

> "قصہ نگار اپنے کرداروں کے متعلق واقعیت کی ایسی فضا پیدا کرتا ہے اور ان سے قارئین کی شناسائی کو اس قدر محرمانہ بنا دیتا ہے کہ جن گوشوں پر اس کی ڈالی ہوئی تفصیل کی روشنی نہیں پڑتی، وہ بھی پڑھنے والوں پر اجاگر ہو جاتے ہیں۔"(۸)

خواتین کردار:

ناطق کے ناول میں تمام جاندار کردار مردانہ ہیں ان کے ناول میں کوئی مضبوط خاتون کردار نظر نہیں آتا۔ تمام ناول کا رویہ پدرسری نظام کے گرد گھومتا ہے۔ کیتھی کا کردار ولیم کے کردادر کی سپورٹ میں لکھا گیا ہے۔ خواتین کی ناول میں موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔

منظر نگاری:

علی اکبر ناطق کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں پنجاب کا رنگ ایسے گھولتے ہیں کہ قاری خود کو پنجاب کے انہیں کھیتوں کھلیانوں اور گلی کوچوں میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے قلم سے پنجاب کی ثقافت کی تصویر کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

> "ولیم جھنڈ والا پہنچا تو اک بج چکا تھا۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ اس لیے گاؤں اور ارد گرد کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی سردی کی دھوپ جب چمک کر نکلتی ہے تو کچھ زیادہ ہی سفید ہو جاتی ہے۔ ولیم کا یہ چھوٹا سا قافلہ اس کی

ایما پر پانچ چھ منٹ تک جھنڈو والا سے ڈیڑھ سو گز پیچھے ہی رکا رہا۔ جیپ پر بیٹھے
بیٹھے ولیم جائزہ لینے لگا۔ گاؤں کے ارد گرد زیادہ تر کماد، ہری ہری برسن کے
کھیتوں کے بیچ دور تک پھیلے ہوئے توریے کے زرد زرد پھول اور چری کی فصلیں
تھیں۔ ایک دو جگہ گڑ بنانے کے بیلنے لگے ہوئے تھے اور آگ پر چڑھتی ہوئی
گنے کی پت سے اٹھنے والی حرارت کی خوشبو ہوا میں گھل مل کر سانسوں کو مہکا
رہی تھی۔"(۹)

جزئیات نگاری:

علی اکبر ناطق نے اس ناول نولکھی کوٹھی میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ انہوں نے دور حاضر کے ناول نگاروں کے برعکس ناول میں جزئیات نگاری کا استعمال بڑھادیا ہے۔ وہ ہر واقعے کی تفصیل اور جزئیات بیان کرتے ہیں اور یہ بات ان کی تحریر میں خوبصورتی تو پیدا کرتی ہی ہے اس کے ساتھ ہی قاری کے لیے انہماک کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ ناطق اپنے قاری کو وہ سب دکھانا چاہتے ہیں جو جو وہ خود محسوس کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں۔ کسی جگہ جزئیات ضروری قرار دی جاتی ہیں مگر کسی جگہ واقعات کو طول دینے سے قاری کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ مگر ناطق کی جزئیات نگاری ناول کے ماحول کو قاری کے لیے دلفریب بناتی ہے اور اس کی دلچسپی ناول میں بڑھ جاتی ہے۔ ناطق چونکہ پچھلے دور کی کہانی بیان کر رہا ہے تو اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اسی زمانے میں لے جائے اور یہ کام ناطق نے جزئیات کے ذریعے کیا ہے۔ اگر اس ناول میں اس قدر خوبصورت جزئیات نگاری نہ ہوتی تو یہ ناول ایک سٹیٹمنٹ بن جاتا یا صرف بیانیہ۔

زبان و بیان:

ناول کی زبان بہت سادہ اور صاف ہے۔ کرداروں کے مطابق ان کی زبان اور ان کا اسلوب بدلنے میں ناطق مہارت سے کام لیتا ہے۔ جیسا کردار ہے اس کی زبان اور الفاظ اسی کے دل و دماغ سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ناطق چونکہ ایک شاعر ہے اور اس نے اپنی تخلیقی قوتوں سے ناول میں بھی شاعرانہ رنگ بھرا ہے۔ بعض مقامات پر تو باقاعدہ شاعری کو

ناول میں بھی کیا ہے جس کی وجہ سے ناول کے حسن میں اضافہ ہوا ہے اور قاری کو اتنے طویل ناول میں شاعری کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتے ہیں۔ ناطق کے ناول میں شامل ایک نظم کا ٹکڑا دیکھیے۔ ملاحظہ ہو:

"کیا تم اس دھوپ کو دیکھنا چاہو گے

جو نکلتی ہے جاتی نہیں

نہ اس کی روشنی میں آنکھیں چندھیاتی ہیں

نہ سڑک پہ عورتیں عرق آلودہ ہوتی ہیں

وہ دھوپ نومبر کی خاموش وادی میں ہے

نومبر کی دھوپ کو دیکھ سکتے ہو

نرم لباس کی طرح محسوس کر سکتے ہو"(۱۰)

علی اکبر ناطق کے ناول نولکھی کوٹھی پر ظفر اقبال نے کالم لکھا جس میں انہوں نے ناطق کے فن کو سراہا:

"ناطق کے ناول نے مجھے حیران تو نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کی دھاک پہلے ہی بٹھا چکا تھا۔
البتہ پریشان ضرور کیا کہ ع
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی"(۱۱)

علی اکبر ناطق وہ ناول نگار ہے جس نے نہ صرف ناول فکشن میں بلکہ شاعری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ جدید نقاد ان کی شاعری اور ان کے فکشن کا دم بھرتے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک میں ناطق کو پڑھا جاتا ہے اور ان کے ناول کو بھی دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ ناطق ایک ایسا تخلیق کار ہے جو جس ادبی صنف پر قلم اٹھاتا ہے اس میں اپنا نام رقم کرتا

ہے۔ ناطق کا ابھی تک ایک ہی ناول شائع ہوا ہے مگر اس ایک ناول نے ناطق کو اردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ امجد سلیم منہاس ناطق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علی اکبر ناطق۔۔۔۔ حیران کر دینے والا شاعر اور کہانی کار تو تھا ہی لیکن اب ناول نگاری کی دنیا کو نیا رخ دینے بھی آ پہنچا ہے۔ لگتا ہے یہ نوجوان لٹریچر کا کوئی کچھ بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اور دل و دماغ کے گھوڑے کو وسیع میدانوں مین سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ تاریخ، ادب اور سیاسیات میں قائم لگے بندھے تصورات کو چیلنج کرنے کے نتیجے میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے لگتا ہے کہ ایک نیا بیانیہ تخلیق ہونے جا رہا ہے۔"(۱۲)

علی اکبر ناطق نے بہت کم عرصے میں بہت زیادہ شہرت کمائی ہے اسی وجہ سے ادب کی دنیا میں ان کے بے شمار مخالف بھی پیدا ہو گئے۔ مگر اس کا ناطق کے ادبی سفر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ صرف پاکستان کے ادیب اور ناقدین بلکہ ہندوستان کے بڑے ناقدین کی توجہ ناطق کی تخلیقات پر ہے۔ شمس الرحمن فاروقی ناطق کے کے ادبی سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علی اکبر ناطق سے اردو ادب جتنی بھی امیدیں وابستہ کرے، نامناسب نہ ہو گا۔ ان کا سفر بہت لمبا ہو گا لیکن ان کی راہیں کشادہ اور منفعت سے بھری ہوئی ہیں۔"(۱۳)

پاکستانی ادبی منظر نامے پر ناطق نے جس طرح اپنے فکشن اور شاعری کے ذریعے خود کو متعارف کروایا اور پھر چند دنوں میں ترقی کا سفر طے کیا کہ بڑے بڑے نقاد اور تخلیق کار ناطق کے معترف ہو گئے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ناطق کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"علی اکبر ناطق نے نسبتاً دیر سے لکھنا شروع کیا، لیکن جب لکھنا شروع کیا تو مسلسل لکھا۔ صرف آٹھ برسوں میں نظموں کے دو مجموعے، ایک ناول اور افسانوں کے دو مجموعے، اور دونوں کے انگریزی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں

ملک اور بیرون ملک جس تیزی سے، اور جس بڑے پیمانے پر شہرت ملی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک واقعہ ہے۔"(۱۴)

خاتمہ:

نو لکھی کوٹھی ناول کا نام اس کوٹھی کی نسبت سے رکھا گیا جو کہ اوکاڑہ میں موجود ہے۔ ناول میں جہاں ناطق نے کہانی بیان کی ہے وہیں اس کے زیادہ تر واقعات حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ناول کے بہت سے کردار بھی حقیقی کردار ہیں۔ نو لکھی دراصل اپنی کہانی ساتھ لے کر آئی ہے۔ جس میں ناطق نے ناول کے رنگ بھر دیے۔ اس ناول میں جہاں بہت سی منفی و مثبت باتیں ہیں وہیں اس میں ناطق کا مخصوص لہجہ بھی جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ناول نگار مولوی طبقے پر طنز کے نشتر چلاتا نظر آتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے نقصانات کو ناول نگار نے اپنے انداز سے پیش کیا۔ وہ تقسیم سے خائف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے تیکھے انداز میں ہمارے ایڈمنسٹریشن سسٹم کی حقیقت بیان کی ہے۔ ناطق نے مکمل پنجابی ثقافت اور علاقائی مناسبت سے ناول میں جزئیات بیان کی ہیں۔ ناطق نے یہ ناول صرف نقادوں اور ادیبوں کے لیے نہیں لکھا بلکہ اس میں عام قاری کی تفریح و ذوق کا سامان بھی موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ صدیقی، عظیم الشان (۲۰۰۸) اردو ناول؛ آغاز و ارتقاء، دہلی، ایجوکیشن پبلیشنگ ہاؤس، ص ۲۷

۲۔ فاروقی، محمد احسن (۲۰۰۶) ناول کیا ہے، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص ۲۱

۳۔ حسینی، علی عباس (۲۰۰۷) ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص ۴۲

۴۔ تمکین، طارق (۲۰۱۱) جدید اردو ناول؛ تنقید و تجزیہ، جالندھر، اکشت پبلیکیشنز، ۱۲

۵۔ اختر، سلیم (۲۰۰۹) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ص ۴۸۶۔۴۸۷

۶۔ حسینی، علی عباس (۱۹۹۴) ارردو ناول کی تاریخ و تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص ۲۳۲

۷۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۴) نو لکھی کوٹھی، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۴۳۲

۸۔ الہدیٰ، نجم (۱۹۸۰) کردار اور کردار نگاری، مظفر پور، بہار اردو اکادمی، ص ۷۸

۹۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۴) نو لکھی کوٹھی، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۸۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۰۴

۱۱۔ اقبال، ظفر، (۲۰۱۵) دال دلیا، روزنامہ دنیا۔ ۲۵ جولائی

۱۲۔ سلیم منہاس، امجد (۲۰۱۴) نو لکھی کوٹھی، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص بیک فلیپ

۱۳۔ فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۱۹) رہشم بنتا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۴

۱۴۔ نیر، ناصر عباس (۲۰۱۶) ھئیت شعر، اسلام آباد، اسوۃ کالج، ص بیک فلیپ

مرقع آزاد

فقیر بستی میں تھا:

فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا

کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا

علی اکبر ناطق نے "محمد حسین آزاد" کا مرقع لکھا جس کا نام "فقیر بستی میں تھا" ہے۔ علی اکبر ناطق نے ایم فل اردو منہاج یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا اور ان کا مقالہ محمد حسین آزاد پر تھا اور اسی مقالے میں رد و بدل کر کے ناطق نے اپنی تخلیقی مہارت سے ایک مرقع کی شکل میں شائع کرایا جسے فقیر بستی میں تھا کا نام دیا۔ فقیر بستی میں تھا ۲۰۱۹ میں عکس پبلیکیشنز لاہور نے چھاپا۔ یہ کتاب ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ کے بعد اس کتاب کو ۴۵ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر عنوان میں آزادی زندگی کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں مصادر و مراجع بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کا انتساب "آغا سلمان باقر" کے نام ہے۔

مرقع کی روایت:

مرقع کے معنی "پیوند لگانا" تصویر یا تصویروں کی کتاب، مرمت شدہ، وغیرہ ہیں اصطلاح میں منظر نگاری، خاکہ اتارنا، یا نقشہ کھینچنا ہے۔

ادبی اصلاح میں مرقع نگاری سے مراد کسی شخصیت کی لفظی تصویر کو تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کرنا کہ اس کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔ دیگر اصناف کی طرح خاکہ نگاری بھی ہمارے ہاں مغرب سے آئی۔ انگریزی میں اس کے "سکیچ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اردو میں اس کے لیے چند اصطلاحیں مروج ہیں جن میں خاکہ نگاری، مرقع نگاری، قلمی مرقع، شخصی مرقع، وغیرہ شامل ہیں۔ مرقع نگاری کی تعریف میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"اسکیچ کی لیے اردو میں "خاکہ نگاری"، "مرقع"،" قلمی تصویر" وغیرہ
اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں خاکہ سب سے زیادہ موزوں ہے کونکہ
اسکیچ کا پورا مفہوم اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے۔"(۱)

مرقع یا خاکہ کا تعلق براہ راست شخصیت سے ہے۔ محبوب شخص کی قلم کے ساتھ تصویر کشی کرنا اس کی جزئیات کو واقعات کے ساتھ ملا کر تخلیق کار اپنی فنی مہارت سے اس شخصیت کو قاری کے سامنے روبرو کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اس بارے میں رقم طراز ہیں:

"خاکہ صفحہ قرطاس پر نوک قلم سے بنائی ہوئی سیک شبیہ ہے۔ یہ بے جان
ساکت اور گم سم نہیں ہوتی۔ یہ بولتی ہوئی متحرک پر کیف تصویر ہے۔ ایک
مصور یا بت تراش کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکر میں کسی دل پزیر تہوار
کی جھلک بھی دے دے مگر ایسی تصویر بنانا، بت تراش یا فوٹو گرافر کے بس سے
باہر ہے جسے دیکھ کر ہم فرد کی سیرت اور انفرادیت کا بھی اندازہ کریں۔" (۲)

انگریزی ادب میں مرقع کی روایت کافی پرانی ہے مگر اردو ادب میں یہ بیسویں صدی میں آیا۔ ہمارے ہاں اب بھی یہ خیال زور پکڑ چکا ہے کہ اردو میں خاکہ نگاری کا کام زیادہ نہیں کیا گیا چند گنے چنے مرقعے یا خاکے ہیں جن کو باقاعدہ خاکہ کہا جا سکتا ہے مگر ادبی ناقدین کی رائے کچھ مختلف ہے۔ بقول نثار احمد فاروقی:

"اردو میں خاکہ نگاری کا ایک وسیع میدان ہے۔ اور اس موضوع پر ہمارا سرمایہ
کچھ اتنا حقیر اور کم تر نہیں کہ سرسری طور سے اس کا جائزہ لیا جا سکے۔"(۳)

اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا مگر اس سے پہلے ہمیں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ اس حوالے سے شعرائے اردو کے تزکرے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ محمد حسین آزاد وہ تزکرہ نگار ہیں جنہوں نے مختلف شعراء کی شخصیت، عادات، شخصی خاکے جس میں شخصیت کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مگر ان تزکروں کو باقاعدہ خاکہ یا مرقع نہیں کہا جا سکتا۔ آزاد کے علاوہ مرزا ہادی رسوا، شرر، اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش

ملتے ہیں۔ اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے جو خاکے لکھے وہ خاکہ نگاری کی بنیاد قرار پائے۔ ان کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔

فنی حوالے سے خاکہ نگاری کی تکنیک میں جو عناصر ترکیبی اہم ہیں وہ درج ذیل ہیں:

کردار نگاری

واقعہ نگاری

اختصار

منظر نگاری

وحدت تاثر

خاکے چونکے دوسرے اصناف ادب سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان میں نئے تجربات کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ عام طور پر کسی شخصیت کا خاکہ لکھا جاتا ہے تو اس مین اس کی عادات و اطوار، رہن سہن، بول چال، صحبتیں، محاسن و معائب وغیرہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس میں قوت متخیلہ کا کام بہت کم رہ جاتا ہے۔ مگر کچھ خاکہ نگاروں نے تکنیک کے حوالے سے جدت سے کام لیااور نئے تجربات کیے۔ اور خاکہ نگاری میں سسپنس اور ڈرامائیت کو شامل کر لیا۔ خاکہ نگاری میں زبان واسلوب کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ اور اختصار سے خاکے کی جمعیت مکمل کرنے کا ڈھب جس خاکہ نگار کے پاس ہو وہ عمدہ مرقع لکھ سکتا ہے۔ عابد سہیل نے خاکے میں اشعار، حکایات، محاورے اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل کیے اور خاکہ نگاری کو وسیع کر دیا۔

خاکہ نگاری ایک نازک فن ہے۔ اس میں سماجی، ادبی، مزہبی، سیاسی، معاشرتی شخصیت شامل ہو سکتی ہے۔ خاکہ کسی بھی انسان کا لکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اپنی پسندیدہ شخصیت اور اساتذہ کا خاکہ لکھنا ادب میں رائج رہا ہے۔ اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ فرحت اللہ بیگ کا ۱۹۲۷ میں "نزیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خاکہ

نگاری میں خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور دیگر کئی نام قابلِ ذکر ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی خاکے لکھے جن میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو وغیرہ شامل ہیں۔ خاکہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے اندر جدید تبدیلیاں سمیٹ کر جدید خاکہ وجود میں آیا۔ مرقع کی جامع تعریف پروفیسر انور جمال کے ہاں ملتی ہے:

> "کسی واقعے یا منظر کو اس طرح منظوم کرنا کہ پوراواقعہ یا منظر، تصویر کی صورت میں نظروں کے سامنے پھر جائے۔
> شاعر کسی واقعے یا منظر کے اصلی اور حقیقی جزئیات کے علاوہ اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے مثالی جزئیات بھی بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے، یہ مرقع نگاری ہے۔
> گویا کسی واقعے یا منظر کی لفظی تصور کشی "مرقع نگاری" کہلاتی ہے۔
> اردو میں نظیر اکبر آبادی، میر انیس، اقبال اور جوش کی شاعری مرقع نگاری کی مثالیں ہیں۔"(۴)

علی اکبر ناطق بطور مرقع نگار:

علی اکبر ناطق نے منہاج یونیورسٹی سے ایم فل کیا اور محمد حسین آزاد پر ان کا مقالہ بعنوان "اماکن و اسفار محمد حسین آزاد" ڈاکٹر مختار عزمی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ علی اکبر ناطق ایک ادب دوست انسان ہیں اور آزاد کے چاہنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے لگن اور انہماک سے مقالہ مکمل کیا۔ جب مقالہ مکمل ہوا تو وہ اس قدر جامع تھا کہ اساتذہ اور دیگر احباب جو ناطق کی فنی صلاحیتوں سے واقف تھے اس کو کتابی شکل میں شائع کرانے کا مشورہ دیا۔ اور ناطق نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مقالے میں چند تبدیلیاں اور ردوبدل کر کے اسے مرقع کے اصولوں کے مطابق ڈھالا اور محمد حسین آزاد کی زندگی پر ایک کتاب "فقیر بستی میں تھا" وجود میں آئی۔ علی اکبر ناطق اپنی اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "اس کتاب کی تیاری میں جن احباب کی شکر گزاری لازم ہے، ان میں ڈاکٹر مختار عزمی صاحب سر فہرست ہیں کہ میری ہر قدم پر دل و نظر کے ساتھ

حوصلہ افزائی کی۔ دوسری شکر گزاری آغا سلمان باقی کی ہے۔ جو ہر طور سے
میرے محسن ہیں، اول مولانا آزاد کے نبیرہ ہیں، دوم ہر سے کاموں کا سرپرست،
تعاون دینے والے بھی ہیں۔" (۵)

علی اکبر ناطق نے جس شخصیت کا مرقع لکھا وہی شخصیت یعنی محمد حسین آزاد ہی خاکے کے بانی رہے ہیں۔ آزاد نے انشا پردازی اور مرقع نگاری کے لیے سپاٹ تحریر اور ٹھوس حقائق کی بجائے تخیل اور تخلیقی کمالات سے کام لیا۔ آزاد کے مرقعوں میں لفظی تصور کشی کی ایسی عمدہ مثالیں ملتی ہیں کہ وہ مرقع خیالی ہونے کے ساتھ حقیقت لگتا ہے اور قاری کو جاندار معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی "نیرنگ خیال" میں خیالی مرقعے پڑھ کر ان پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے کیونکہ آزاد نے اس قدر سلیقے سے اور فن سے مرقع نگاری ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور نثر نگار کے ہاں ایسی نثر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آزاد کے مرقعے پڑھتے ہوئے قاری حقیقت اور خیال کا فرق بھول جاتا ہے اور تخلیق کار کے اسلوب اور فن کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے سید عبداللہ نے آزاد کو اردو کا سربرآوردہ مرقع نگار کہا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"محمد حسین آزاد نے بھی زیادہ تر انگریزی مضامین ہی سے استفادہ کیا لیکن
انہوں نے اپنی مشرقیت کو بہرحال قائم رکھنے کی کوشش کی۔ گلشن امید کی
بہار، سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، سیر زندگی، علوم کی بد نصیبی اور خوش طبعی جیسے
مضامین میں آزاد نے اپنی شگفتہ انشائی سے خوبصورت لفظی مرقعے بنائے ہیں۔
اور انشاء نگاری میں اپنی انفرادیت کا پختہ نقش قائم کیا۔ (۶)

آزاد کی کتاب "آب حیات" ہو یا پھر "نیرنگ خیال" "دربار اکبری" "قصص ہند" ہو، ان تمام میں آزاد نے مرقع نگاری کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے ہیں کہ اس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ نیرنگ خیال میں آزاد نے ظرافت کے تعارف میں جو تخلیقی گلکاریاں پیش کی ہین وہ کسی باقاعدہ مرقع لکھنے والے کے ہاں بھی دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ آزاد نے "سر سید احمد خان" کا خاکہ "محنت پسند خردمند" لکھا اس میں ان کا تعارف بیان کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے وہاں احتیاج و افلاس نہ ہو تو کیا۔۔۔اب پچتانے سے کیا حاصل ہے۔ ہاں ہمت کرو اور محنت پر قمر باندھو!۔۔۔احتیاج اور افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ جس کا نام محنت پسند خرد مند ہے۔اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے۔ کونکہ اس نے امید کا دودھ پیا ہے۔ ہنر مندی نے اسے پالا ہے۔ کمال کا شاگرد ہے، ہو سکے تو جا کر اس کی خدمت کرو۔"(۷)

آزاد نے اس خاکے میں محنت پسند خرد مند کا نقشہ کھینچا ہے اور اپنے تخیل سے اس کردار کو امر کیا ہے وہ اس سپاٹ نثر اور روایتی تعارف سے ممکن نہ تھا۔ آزاد کی "آب حیات" بھی خاکے، تزکرے اور مرقعے کا آغاز ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا تذکرہ نہیں لکھا نہ ہی خاکے میں تخیل کا عمل دخل رکھا۔ آزاد کی اسی کتاب نے تزکروں اور مرقعوں کی بنیاد رکھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ رقمطراز ہیں۔:

" اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اردو میں قائم ہوا۔ حالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعے کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔"(۸)

نہ صرف یہ خاکہ نگاری کی بنیاد تھی بلکہ اس کتاب میں آزد نے اس دور کے شعراء کے جو اوصاف بیان کیے ہیں اور جس طریقے سے ان کو ایک دوسرے سے الگ مام دے کر ان کی شاعری کی پوری تصویر صرف چند الفاظ میں بیان کی وہ کسی بھی شاعر کا مکمل مرقع معلوم ہوتی ہے۔ کلیم الدین احمد اس بارے میں لکھتے ہیں:

"آزاد شاعروں کے نام نہیں گناتے، متفرق اوصاف و نقائص کی فہرست مرتب نہیں کرتے۔ ہر شاعر کی زندہ تصویر کھینچتے ہیں۔ میر، سودا، درد، انشاء، مصحفی، ناسخ غرض ہر شاعر کی الگ الگ تصویر ہے۔"(۹)

علی اکبر ناطق نے بھی آزاد کا مرقع لکھتے ہوئے ان تمام باتوں کا خیال کیا جو انہوں نے خود آزاد سے سیکھیں۔ علی اکبر ناطق کے مرقعے میں وہ سپاٹ اور ٹھوس نثر نظر نہیں آتی بلکہ قاری ایک خوشگوار فضا میں آگے بڑھتا ہے۔ علی اکبر ناطق نے مرقع نگاری کے جدید اصولوں کو بروئے کار لا کر آزاد کی زندگی کے ان پہلوؤں سے پردہ اٹھایا جو قاری کیلیے توجہ کا باعث

ہیں۔ آزاد پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر علی اکبر ناطق نے اپنے شاعرانہ تخیل اور نثری مہارت سے آزاد کی زندگی کے واقعات کو جاندار بنا دیا۔

"محمد حسین آزاد کو جیند کا دربار راس نہ آیا، یہاں گلے میں فکر معاش کا پھندہ جان کی امان کے ساتھ بندھا پڑا تھا کہ دونوں کے کھلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، دوست ایسے دشمن بنے جاتے تھے کہ صورت پہچاننے سے پرے جاتے تھے۔ سب جانتے تھے محمد حسین آدمی نہیں، بغاوت کا وہ ہیولا ہمارے آس پاس گھومتا ہے کہ اس کا سایہ جس پر گزر جائے گا، ہمارے تخت کی بجائے تختہ کا ریشم اس کے گلے میں آئے گا۔ یہاں عام ادمی تو ایک طرف راجے مہاراجے تک انگریز سرکار کی حاضری بھرنے میں اپنی امان پاتے تھے۔ ایسے میں کون قوی دل اور جری ہمت تھا کہ مولوی صاحب کے ساتھ اخلاص کا پیرہ نبھاتا اور مولانا آزاد کو گلے لگاتا۔"(۱۰)

علی اکبر ناطق چونکہ ایک شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ نثر کی تین کتابیں جن میں دو افسانوی مجموعے اور ایک ناول شامل ہے منظر عام پر آچکی ہیں اور ادب کی دنیا میں ان کتب کا چرچا ہے۔ ناطق کی نظموں کی تین کتابیں اور ایک غزل کی کتاب بھی ان کے ادبی سرمائے میں خوبصورت اضافہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناطق نے جب "فقیر بستی میں تھا" لکھا اس وقت وہ اپنے تخلیقی فن کی معراج پر تھے اور یہ کتاب ان کے شاعرانہ اسلوب اور رواں نثری فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آزاد کی ہجرت کی کہانی سناتے ہوئے ناطق ایک مضمون بعنوان "یہ بستیاں اجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں" میں اپنے علم و دانش کو عملی تحریر میں سمو دیا۔

" یہ زمانہ دنیائے رنگ و بو اور باغ گل و جو پر صرصر کا وہ بگولا تھا جس کے زور نے کاخ نہ چھوڑا، کو نہ چھوڑا۔ اس کے قوت اختیار نے پست و بلند سب ہموار کر دیے اور ایسے کیے کہ پھر قیامت تک اپنے مقام تک نہ پہنچے۔ دہلی کے اشراف کیا، رزیل کیا، امراء کیا، حرفت پیشہ کیا، تمام چوباروں کے کنگرے گر گر کر پاتالوں کا رزق ہو گئے۔ شیشہ و جام سنگر پتھر ہوئے۔ لعل و گوہر خزف و

خراب ہوئے، مکان و محل ٹیلوں میں بدل گئے اور شاہ جہان آباد کا نام خراب آباد کے وجود سے رونق پانے لگا۔"(۱۱)

ناطق کا اسلوب:

علی اکبر ناطق نے اس سوانحی ناول " فقیر بستی میں تھا" کا اسلوب قدرے مشکل ہے۔ ناطق نے کہیں بھی تحقیقی اسلوب سے کام نہیں لیا بلکہ پوری کتاب میں ناطق کا اسلوب تخلیقی ہے۔ ناطق نے دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ لاہور کا بھی نقشہ من و عن بیان کرنے کی کوشش کی مگر اسلوب کی پیچیدگی کی وجہ سے قاری کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناطق نے مشکل الفاظ استعمال کر کے نثر کو مقفع و مسجع بنانے کی کاشش کی مگر اس سے تحریر کا حسن ماند پڑ گیا کہ قاری الفاظ کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گیا اور کہانی سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ مگر بعض جگہوں پر ناطق نے اس روانگی اور تسلسل کے ساتھ نثر کو آگے بڑھایا کہ وہ مرقعے کی ضروریات پر پورا اترتی محسوس ہوتی ہے۔ ناطق نہ صرف واقعات بیان کرتا ہے بلکہ اسے کہانی کی شکل دے کر مزید دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ناطق نے تمام کتاب میں آزاد کی زندگی بیان کی ہے مگر کتاب کے آخر میں ناطق خود اتنا زیادہ نظر آرہا ہے کہ یہ خود ناطق کی زندگی کی کہانی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور آزاد کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے قاری علی اکبر ناطق کا مرقع پڑھ رہا ہے۔

آغا سلمان باقر:

آغا سلمان باقر آزاد کے خانوادے کا وہ چراغ ہیں جو اب تک علم کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ علی اکبر ناطق اور سلمان باقر کا پیاسے اور کنویں والا رشتہ ہے کہ ناطق تو علم کی پیاس بجھانے کی خاطر سرحدیں تک عبور کر جاتا ہے تو لاہور میں مقیم آغا سلمان باقر سے کیسے شناسائی نہ ہوتی۔ ناطق نے آغا سمان باقر کے توسط سے کتاب مکمل کی۔ سلمان باقر ادب دوست ہیں اور ادب کے متلاشی جب ان کے پاس آتے ہیں تو وہ ہر ممکن مدد فراہم کرتے ہیں کہ یہ ان کا خاندانی عمل ہے۔ علی اکبر ناطق کی یہ کتاب ایک تحقیقی مقالہ ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار "آغا سلمان باقر" پر ہے۔ علی اکبر ناطق نے ہر دوسرے صفحے پر

آغا سلمان باقر کے حوالے اور اقتباسات شامل کیے ہین گویا تمام تر معلومات کا ماخذ وہی ہیں۔ کتاب میں تحقیقی مقالے کی طرح اقتباسات شامل کیے گئے ہیں اور بعض اقتباسات تو اتنے لمبے ہیں کہ ۳ سے ۴ صفحات تک چلتے ہیں۔ جس سے مصنف کی اپنی ذات کہیں غائب ہو جاتی ہے اور کتاب آغا سلمان باقر کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار تحقیقی مقالے کے لیے تو قابل قبول ہو سکتا ہے مگر ایک مرقع میں یہ طریقہ احسن نہیں۔ ہر دوسرے صفحے پر سلمان باقر اور محمد باقر اور دیگر کے اقتباس لکھے پڑے ہیں اور اقتباسات کی بھرمار میں مصنف کا اپنا انداز بیاں اور شخصیت کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ جیسے مصنف یہ ساری کہانی کسی اور کی زبانی لکھ رہے ہیں۔

"آزاد کو بچپن سے ورد اور وظیفے پڑھنے کا شوق تھا۔ انسان کی فطرت کا قاعدہ ہے کہ جس ماحول میں وہ تربیت پاتا ہے وہ اس کی طبیعت پر اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ چونکہ ان کا خاندان مجتہدین کا خاندان تھا۔ اسلیئے وظائف اور اوراد کا شوق بھی قدرتی تھا۔ چنانچہ انہوں نے سر در جرنیل سنگھ کے مکان میں رہ کر دعائے صنم قریش کا ورد شروع کیا۔ یہ وظیفہ چودہ دن تک آدھی رات کے بعد پڑھا جاتا ہے۔ اور چودہ دن کے بعد دلی مراد بر آتی ہے۔ آزاد کو اس وظیفہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ جرنیل سنگھ کے کیمپ کے پاس ایک کھنڈر کان تھا جو اس وظیفے کی لیے نہایت موزوں تھا۔ آزاد چودہ راتیں برابر وظیفہ پڑھ کر کھنڈر میں سوتے رہے، آخری رات کو آزاد نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے۔ محمد حسین اٹھ لے، کنجیاں لے، یہ آواز تین مرتبہ کانوں میں آئی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اٹھ کر ادھر ادھر کنجیاں تلاش کرنی شروع کیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ قفل مراد کی کنجیاں ہاتھ آگئیں۔ آزاد اٹھے اور چل دیے۔"(۱۲)

اس کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر اتنے ذخیم اقتباسات ہیں کہ وہ چار سے پانچ صفحے تک ایک اقتباس چلتا جاتا ہے۔ جیسے صفحہ ۴۱ سے شروع ہونے والا اقتباس صفحہ ۴۵ تک جاری ہے۔

دلی، لکھنؤ اور لاہور:

علی اکبر ناطق نے آزاد کی زندگی کی کہانی بیان کرتے کرتے دلی لکھنؤ اور لاہور کے جو مرقعے کھینچے ہیں وہ اس کتاب کی قدر بڑھا دیتے ہیں۔ ناطق نے گلی کوچوں سے لے کر دربار تک دلی اور لکھنؤ کی ثقافت کو ایسے بیان کیا ہے کہ اس سے پہلے متعدد محقق کار بیان نہ کر سکے۔ دلی کی ثقافت ہو یا لکھنؤ کا مرقع علی اکبر ناطق سے پہلے بڑے بڑے نثر نگار اور شاعر اپنے اپنے طریقے سے بیان کر چکے ہیں مگر علی اکبر ناطق نے اسے اپنے جدید اسلوب سے ایسے سجایا کہ قاری ان گلیوں اور درباروں سے گزرتا ہوا لاہور آن پہنچا۔ علی اکبر ناطق کا اسلوب دلکش ہے اور تحقیق جاندار ہے۔ ناطق نے اپنی تحقیق اور تخلیق سے کچھ بے جا مغالطے دور کیے اور ان کی وجوہات بھی درج کیں۔ یہ ثقافتی، تاریخی، ادبی اور عصری حوالے سے ایک کارنامہ ہے۔

ناطق اور آزاد:

علی اکبر ناطق نے محمد حسین آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھتے وقت یہ بات ذہن میں نہیں رکھی ہو گی کہ یہ تحقیقی مقالہ ڈگری مکمل کرنے کے لیے لکھا جا رہا ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے۔ ناطق ادب دوست انسان تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ ناطق کا آزاد کی آزاد کے ساتھ وابستگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ناطق نے یہ مقالہ کس قدر محنت اور لگن سے مکمل کیا ہو گا۔ اس مقالے کو ایم کی ایک ڈگری مکمل کرنے کے لیے نہیں لکھا گیا۔ نہ ہی یہ اتنا آسان کام لگتا ہے کیونکہ کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ناطق نے برسوں پیچھے جا کر گلیوں کی خاک چھانی ہے ایک اک لفظ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے میں کتنا وقت اور کتنی محارت درکار ہو گی۔ کیونکہ عام طور پر ہماری جامعات میں اس قسم کے مقالے کا رواج نہیں رہا کہ کوئی تحقیقی کام ہو۔ ہمارے ہاں اب پاس حوالوں کا ڈھیر اور کچھ کاپی سے کاپی کیے گیا مواد ہی مقالہ کہلاتا ہے۔ مگر منہاج یونیورسٹی سے کیا گیا ناطق کا یہ ایم فل کا مقالہ اپنی گواہی خود دے رہا ہے کہ اس کو کیسے مکمل کیا گیا ہے اور اس سے آنے والی نسلیں اس کتاب سے کیا حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ یقیناً ایک الگ طرح کا علمی کام ہے جو ادب کا سرمایہ ہے۔

علی اکبر ناطق نے آزاد کے ہم عصر باقی تخلیق کاروں کو اس کے مقابلے اس طرح سے کھڑا کر دیا جیسے وہ تمام آزاد کے دشمن ہوں اور آزاد سے کم تر بھی۔ ناطق نے حالی، سرسید اور دیگر کا ذکر کرتے ہوئے اس قدر بیگانہ رویہ اختیار کیا کہ وہ کسی بھی ادب کے قاری کو ناگواری کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔:

"وہ ڈپٹی نزیر احمد نہیں تھے جو اپنے ہی شاگردوں سے سود کھاتے۔ وہ مولوی شبلی نہیں تھے جو تاریخ اسلام کے بے خونیں کرداروں پر ملمع کاری کر کے تعصبات کے نیزے اچھالتے اور جھوٹ کے سکے پر شفاف چاندی کا پانی چھڑکاتے۔ وہ ذکا اللہ مولوی نہیں تھے جو کینہ توزی میں غالب جیسے عظیم شاعر کی چغلیاں کرتے اور کریم الدین اور مولوی فیروز الدین سے مل کر غالب کے تعلیمات پنجاب سے منظور شدہ وظیفے کی فائیلیں دبالیتے۔ وہ حالی بھی نہیں تھے کہ کی سرسید کے باج گزار بن کر رہ جاتے اور جو وہ کر سکتے تھے نہ کر پائے۔ وہ آزاد تھے، سب سے آزاد تھے، جسے نہ مادیت کی لت تھی، نہ چغل خوری کی عادت تھی، نہ مذہبی مناقشوں اور منافقوں سے علاقہ تھا۔"(۱۳)

علی اکبر ناطق نے آزاد کو بہتر ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام ہم عصروں کو برا بھلا کہہ کر کم تر ثابت کیا۔ جب کہ ناطق نے آزاد کی زندگی کے واقعات بتاتے ہوئے حالی اور آزاد کے روابط اور اکٹھے سفر کرنے کے واقعات بھی درج کیے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد اور مولانا حالی کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کے نام خط کا اقتباس بھی ناطق کی کتاب میں ملتا ہے جس میں سرسید اور محمد حسین آزاد کے باہمی تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ "انجمن پنجاب" میں ان تمام رفقاء اور ہم عصر تخلیق کاروں کے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلق کی مثالیں ملتی تھیں جسے ناطق نے آزاد کی محبت میں نظر انداز کرتے ہوئے تمام کے تمام لوگوں پر سوال کھڑا کر دیا۔ اور اس طرح ناطق نے آزاد کو ان سب سے ممتاز کرنے کی کوشش کی۔ جو کہ ادب کے قارئین کے لیے گمراہی ہے۔

خاتمہ۔

علی اکبر ناطق نے یہ "کتاب فقیر بستی میں تھا" لکھ کر یقیناً ادب کی خدمت کی ہے۔ یہ کتاب تاریخی حوالے سے اہم ہے۔ اس میں تاریخ کے گمنام حوالے ملتے ہیں اور ثقافت کی ایسی جیتی جاگتی تصاویر نظر آتی ہیں کہ قاری خود کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ خواہ وہ دلی کی گلیاں ہوں یا لکھنؤ کے بازار یا پھر لاہور کا آباد شہر ناطق اپنے قاری کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ ناطق کا مشاہدہ تخلیق اور تحقیق ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ بے باکی سے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔

ناطق کی انہیں خوبیوں کے بارے میں فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں:

> "علی اکبر جواں سال ہے اور ایوان ادب میں دلربا شان سے داخل ہوا ہے۔
> اس کا بے خوف مشاہدہ ادب کے لیے مسرت کی نوید ہے۔"(۱۴)

حوالہ جات:

۱۔ فاروقی، نثار احمد (۱۹۶۴) دید و دریافت، دہلی، آزاد کتاب گھر کلاں محل، ص ۱۷۔۱۸

۲۔ امتیاز، احمد (۲۰۰۵) ادبی محاکے، دہلی، اردو محل پبلیکیشنز، ص ۱۹۵

۳۔ فاروقی، نثار احمد (۲۰۱۶) اردو میں خاکہ نگاری، دہلی، عرشیہ پبلیکیشنز، ص ۲۱

۴۔ جمال، انور (۲۰۱۷) ادبی اصطلاحات، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۱۶۲

۵۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) فقیر بستی میں تھا، لاہور، عکس پبلیکیشنز، ص ۷

۶۔ سدید، انور (۲۰۱۴) اردو ادب کی تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ص ۳۰۳

۷۔ آزاد، محمد حسین (۲۰۰۷) نیرنگ خیال، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ص ۵۸۔۵۹

۸۔ سکسینہ، رام بابو (۲۰۰۹) تاریخ ادب اردو، دہلی، عفیف آفسٹ پرنٹرز، ص ۴۲

۹۔ احمد، کلیم الدین (۱۹۷۶) اردو تنقید پر ایک نظر، پٹنہ، پٹنہ لیتھو پریس، ص ۷۰

۱۰۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) فقیر بستی میں تھا، لاہور، عکس پبلیکیشنز، ص ۸۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۸۔۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔۱۳۴

۱۴۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) دست ہنر اور دیدہ بینا، مشمولہ، ریشم بننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۶

باب چہارم

ناطق کی تنقیدی جہت

تنقید کی روایت:

تنقید کا لفظ "نقد" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی جانچنا، کھوج، پرکھ، کھرے کھوٹے کی پہچان، محاسن و معائب میں فرق کرنے کے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں کسی فن پارے کی خامیوں اور خوبیوں کو الگ الگ کرنا اور اس فن پارے کا ادب میں مقام متعین کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ تنقید کا مصدر "نقد" ہے جو کہ عربی لفظ ہے مگر اردو میں اس کے استعمال کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

"تنقید کا لفظ ہمارے یہاں سب سے پہلے مہدی افادی نے میں استعمال کیا، بلکہ انہوں نے ایک قدم بڑھ کر "تنقید عالیہ" کی اصطلاح بنائی، جو ان کے خیال میں کسی انگریزی اصطلاح High criticism کا ترجمہ تھی تنقید کیلئے انگریزی میں لفظ 'criticism' استعمال ہوتا ہے۔ اور ناقد کیلئے critic استعمال ہوتا ہے۔(۱)

اس لفظ کی تشریح کیلئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

"بعض محققین کی نظر میں criticism کا ماخذ عربی لفظ غربال (چھلنی) ہے جو لفظ Garble کا معرب ہے، غربال کی اصل لاطینی ہے اور اس کا تعلق لفظ cret سے ہے جس کے معنی پھٹکنا یا چھان پھٹک کرنا ہیں"(۲)

تنقید ایک ایسا فن ہے جس کی بدولت تخلیق کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ باقی تمام علوم کی طرح تنقید کے بھی قوائد وضوابط ہیں جن کو بروئے کار لاکر ہی اعلیٰ تنقید ممکن ہے۔ اس میں وہ تمام امور زیر بحث آتے ہیں جو کسی بھی تخلیق میں موجود ہو سکتے ہیں یا ہوتے ہیں۔ تنقید کو عمل جراحی سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ جو کہ کسی حد تک قابل قبول ہے مگر ان دونوں میں فرق موجود ہے۔ جراحت کے عمل میں مرض کا قبل از جراحت معلوم ہونا لازم ہے جبکہ تنقید میں تخلیق کا مرض تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آل احمد سرور اس بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ (تنقید) تخلیق پر عرف عام میں عمل جراحی بھی کرتی ہے مگر یہ عمل
شاعرانہ طور پر ہوتا ہے اور اسی فضا (تخلیقی عمل) کے اندر رونما ہوتا
ہے۔"(۳)

تنقید کا مقصد صرف معائب تلاشنا نہیں بلکہ کسی تخلیق کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے جس میں خوبی و خامی کی نشاندہی کرکے قاری کیلئے آسانی پیدا کرنا بھی ہے۔ مگر عام طور پر کسی ادب پارے کی تنقید کرتے ہوئے نقاد اس کے عیوب تلاش کرکے سامنے لانے میں ہی تشفیع محسوس کرتا ہے۔ اور ہمارے ہاں یہ رویہ رواج پا چکا ہے کہ تنقید سے مراد نقائص نکالنا ہے۔ مگر تنقید کی کئی جہتیں، پرتیں اور مقاصد و مباحث ہیں مغرب کے کچھ نقادوں کے ہاں تنقید کی تعریف یوں ملتی ہے" آئی اے رچرڈس" تنقید کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح اور بالآخر اس کی
جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے"(۴)

ٹی ایس ایلیٹ کہتے ہیں کہ:

"مانتا ہوں کہ تنقید وہ شعبۂ فکر ہے جو یا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے
کہ 'شاعری کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین
بہم پہنچاتی ہے؟ اشعار لکھے کیوں جاتے ہیں؟ سنائے کیوں جاتے ہیں؟ شاعر
شاعری کیوں کرتا ہے؟ یا ان تمام باتوں کے متعلق علم و آگہی کے چند شعوری یا
غیر شعوری مفروضات قائم کرکے نظم اشعار کی حیثیت متعین کرتا
ہے۔"(۵)

تنقید کا مقصد اصل میں قاری کو تخلیق کے وہ معنی و مطالب مہیا کرنا ہیں جو عام قاری کی پہنچ سے باہر ہیں یا پھر یوں کہہ لیں کہ عام طور پر قاری کسی تخلیق کے ظاہری اور سطحی تشریح تک محدود ہو جاتا ہے اور اس پر معانی کی پرتیں نہیں کھلتیں۔ یہ ایک نقاد کا کام ہے کہ وہ کسی فن پارے کی تمام تر گہرائی ناپ کر اس کی ساری جہتیوں پر روشنی ڈالے تاکہ عام قاری کو بھی فن پارے کو سمجھنے میں آسانی ہو اور فن پارے کا مقام متعین ہو۔

اس بارے میں اردو کے بڑے ناقدین نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> "تنقید اور تحقیق کے درمیان ایک اور رابطہ ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں اس بحث میں پڑے بغیر کہ ان دونوں میں کسے اولیت حاصل ہے، اگر ہم ادب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ یہ دونوں صلاحیتیں ایک دوسرے کے فروغ کے لیے مدد معاون ہوتی ہیں۔ تنقیدی اصول ہمیشہ فنی تخلیقات کی بنیاد پر استوار ہوتے اور عظیم فن پاروں سے اخذ کیے جاتے ہیں مگر ایک بار جب یہ اصول وضع کر لیے جاتے ہیں تو آئندہ فنی تخلیق کی رہنمائی کرتے ہیں۔"(۶)

وحید اختر رقمطراز ہیں:

> "یہ دو کام کرتی ہے۔ اول تو یہ خارجی دنیا کے اہم ترین مظہر، یعنی ادب کو بیان کرنے کے لیے ایسے الفاظ تلاش کرتی ہے جن کا استعمال درستی اور صحت بیان کے لیے ناگزیر ہو۔ یہ اس لیے کہ جو الفاظ ناگزیر ہوں گے ان میں حقیقت کا شائبہ یقیناً ہوگا، کیونکہ ہر وہ لفظ جسے نظر انداز کیا جا سکے یا جس کی ضرورت ایسی نہ ہو کہ اسے پس پشت ڈالنا ممکن ہو، یقیناً اس شے سے نزدیک ترین تعلق نہ رکھتا ہوگا جسے بیان کیا جا رہا ہے۔ تنقید دوسرا کام یہ کرتی ہے کہ صحیح ترین بیان کی تلاش کے ذریعے ایسے اصول دریافت یا مرتب کرتی ہے جس کی روشنی میں صحیح بیان تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلا کام عملی تنقید اور دوسرا نظریاتی تنقید کے ذریعے انجام پاتا ہے۔"(۷)

روایت:

تنقید کی روایت تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ کسی ادب پارے کی پسندیدگی یا برائی یا اس فن پارے کے بارے میں کوئی بھی رائے تنقید کی شروعات ہے۔ اردو ادب میں تنقید کے ابتدائی نقوش تزکروں میں ملتے ہیں۔ جب تذکروں میں کسی شاعر کا کلام اس کی زندگی کے پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا تو یہ دراصل تنقید کی بنیاد تھی۔ مگر اس وقت عام طور پر پسند کے شاعر اور تخلیق کاروں کی محبت میں تذکرے لکھنے کا رواج تھا۔ مگر یہ بہر حال تنقید کی ہی قسم ہے۔ اس دور میں اس کام کیلئے کوئی خاص اصول و ضوابط نہیں تھے اور اس کو بطور فن اہمیت حاصل نہ تھی۔ اس لیے آج کے جدید ترقی یافتہ دور میں ان اصولوں پر تذکروں کو پرکھنا سراسر زیادتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تذکرے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں مگر تنقیدی ادب میں ان کا خاص مقام نہیں ہے۔ مگر ان تذکروں سے تنقید کی راہ ہموار ہوئی ہے اور ان پر عمل کر کے آگے تنقید کی نئی جہتیں کھلی ہیں۔ اردو کے اہم تذکرہ نگاروں میں مرزا علی لطف، میر، محمد حسین آزاد، شیفتہ، مصحفی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے ادب پر بے شمار اثرات دیکھنے کو ملے جہاں ناول افسانے اور شاعری میں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں مغرب سے تنقید کے اصول بھی جدید اردو تنقید نگاری کا حصہ بنے۔ سرسید، حالی و رفقاء اس کی اہم کڑی ہیں۔ حالی کو اس میدان میں بہت پزیرائی ملی اور ان کے دیوان کا مقدمہ ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں پہلی بار ۱۸۹۳ میں "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے چھپ کر سامنے آیا۔ اس کتاب سے حالی نے ادب میں تنقید کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اس میں شعر کی ماہیت، شاعری کے اصول، شعر کی اصناف اور اصلاح کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی۔ حالی کے بعد اردو نقادوں کا ایک گروہ سامنے آیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ زور و شور سے چل پڑا۔ اردو تنقید میں جن نقادوں نے نام پیدا کیا ان میں شبلی، عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، محمد احسن، حسن عسکری، احسن فاروقی، وزیر آغا، سلیم احمد، قمر رئیس، اطہر جاوید، مغنی تبسم، خورشید الاسلام، کلیم احمد، احتشام حسین، سید وقار عظیم، عابد علی عابد، خورشید رضوی، جمیل جالبی، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ شامل ہیں۔ علی اکبر ناطق نے نے بھی اردو تنقید میں اپنا نام منوایا۔ شاعری اور نثر میں اپنا لوہا منوانے کے بعد تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور پہلی تنقیدی کتاب اقبال کی اردو شاعری پر لکھی۔ گو کہ اقبال پر بے شمار کام ہو چکا ہے مگر ناطق نے اقبال کی شاعری میں موضوع سے زیادہ ہیئت کو اہمیت دی اور بقول ناطق انہوں نے اقبال کی شاعری میں وہ چیزیں دریافت کیں جو پہلے سامنے نہیں لائی گئیں۔

علی اکبر ناطق بطور نقاد:

علی اکبر ناطق نے اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب لکھی جس کا نام "ہیئت شعر" ہے۔ اس کتاب میں ناطق نے شعر اقبال کی جمالیاتی ساخت اور فکری نظام پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب "۲۰۱۲" میں اسوہ کالج اسلام آباد نے چھاپی۔ اس کتاب کو "۹" حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ کتاب "۲۲۴" صفحات پر مشتمل ہے۔

اگر چہ اقبال ان شاعروں میں سے ایک ہے جس پر ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد سب سے زیادہ تنقید لکھی گئی۔ ۱۹۷۷ سال اقبال کے طور پر منایا گیا اور اس ایک سال میں ہی اقبال پر کم و بیش ڈیڑھ سو کتب لکھی گئیں۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔ اب تک بلاشبہ کتب کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ جہاں اقبال کی مداح سرائی میں ناقدین نے ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں وہیں ان کے شارحین نے بے شمار غلط فہمیاں پھیلائیں۔ اقبال پر بہت سے فتوے لگے تو دوسری طرف اقبال کو ولی بنا دیا گیا۔ غرض جس نقاد نے تعریف کی تو حد سے گزر گیا اور جس نے نقص نکالے تو وہ بھی حدود و قیود سے آزاد نظر آیا۔ اقبال کی شاعری پر لکھنے کو کچھ نیا نہیں ملتا کیوں کہ ہر پہلو پر بات ہو چکی ہے۔ اقبال کا مرد مومن ہو یا خودی کا فلسفہ، تصور حسن و عشق ہو یا اسلامی تعلیم، مشرقی پہلو ہوں یا مغرب سے دلچسپی کم و بیش ہر پہلو پر بے شمار کتب مل جاتی ہیں۔ اقبال مرد مومن تو ہیں ہی اور اسلامی اقدار و افکار کی ترویج کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اقبال مغرب کے فلسفے سے بخوبی واقف تھے اور اقبال کی بے شمار نظمیں مغربی ادب کا ماخوذ ترجمہ ہیں۔ اقبال نے ورڈز ورتھ کا گہرا مطالعہ کیا اور اس بات کا ذکر انہوں نے اپنی انگریزی بیاض میں بھی کیا۔ دوسرے بے شمار مغربی شعراء جن کا ذکر اقبال کے ہاں ملتا ہے ان میں سیموئل راجرز، براؤننگ، لانگ فیلو، ایمرسن، ولیم کوپر، ٹینی سن، ایمرسن وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال نے شکسپئر کو منظوم انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ وہ شکسپئر سے متاثر تھے اور اس کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ گوئٹے کے بارے میں بھی اقبال نے بات کی کہ اقبال ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ان سے اقبال کا تعلق ہے۔ اقبال نے مغربی ادب سے بہت کچھ سیکھا اور اقبال پر اس کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں جیسے شروع کی شاعری میں بہت سی نظمیں اقبال نے انگریزی سے اردو ترجمہ کیں اور کچھ مصرعے بھی ترجمہ

ہے۔ جیسے اقبال نے "کوپر" کے ایک مصرعے کو اپنی نظم "مرزا غالب" کا مصرع بنایا۔ "کوپر" کا انگریزی مصرع اور اقبال کا ترجمہ شدہ مصرع درج ذیل ہیں:

And, while the wings of fancy still are free

ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اقبال کے ہاں ایسے بے شمار تجربات ملتے ہیں۔ مگر یہ رجحان شروع میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس وقت اقبال پر مغربی جدیدیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مگر بعد میں اقبال کا اپنا تصور شعر ٹھوس شکل میں سامنے آتا ہے۔ اور اگر کوئی رجحان یا مغربی تحریک ان کو اپنے تصور سے متصادم نظر آتی ہے تو وہ بلا جھجک اس کو ترک کر دیتے ہیں۔ اقبال نے نظم معری میں اجتہاد سے کام لیا۔ انہوں نے متعدد قرآنی آیات کا ترجمہ بھی شاعری کی شکل میں پیش کیا۔ اور اقبال پر مشرقی روایات و ادب کی چھاپ بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اقبال پر تنقید کرنے والے نقاد اصل میں خود کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔ کبھی اقبال کو مغربی طرز فکر کا شاعر کہہ دیا جاتا ہے تو وہیں اقبال کو مرد مومن اور اسلامی شاعر اور ولی قرار دے دیا جاتا ہے۔ اردو کے تقریباً ہر بڑے نقاد نے اقبال پر کام کیا۔ علی اکبر ناطق نے بھی اقبال کے شعری نظام پر تنقید لکھی۔ یہ ناطق کی تنقید کی پہلی کتاب ہے اور اس کتاب میں ناطق نے اقبال کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی اردو شاعری میں چھپے اسرار و رموز اور شعر کی ساخت کرافٹ اور جمالیاتی ساخت پر بحث کرتے ہوئے ناطق نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ گھسی پٹی تنقید سے گریز کریں اور اقبال کے شعر کی کوئی نئی جہت دریافت کریں۔ بقول ناطق:

> "ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ عام تاثراتی تنقید سے گریز کیا جائے اور پہلے کہی ہوئی باتوں کو بالکل نہ دہرایا جائے تاکہ نئے پیمانوں پر بحث کے در واہوں اور اقبال کے تخلیقی کام کو سمجھنے کیلئے حقیقی بنیادوں پر کام شروع ہو جو کہ میرے خیال میں پہلے بالکل نہیں کیا گیا۔"(۸)

"ہیئت شعر" نامی کتاب میں اقبال کے شعر پر بحث کے ساتھ ساتھ اقبال کی سوانح پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو نو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں دیگر ذیلی مضامین شامل ہیں۔

۱۔ ماہیت شعر

۲۔ شعر کیا ہے

۳۔ اسلوب

۴۔ شعر اقبال کی جمالیاتی ساخت

۵۔ اقبال اور استعارے کا استعمال

۶۔ شعر اقبال کا فکری جمالیاتی نظام

۷۔ اقبال کی شعری جمالیات اور فکری ارتقا

۸۔ حیات اقبال کی کہانی غلام بھیک نیرنگ کی زبانی

۹۔ اقبال کی چند اہم نظمیں (جمالیاتی اور فکری نقطہ نظر سے)

کتاب کے پہلے حصے میں ناطق نے علمائے شعر اور شعر فہم نقادوں کی آراء کی روشنی میں شعر کے وجود اور شعر کی تفہیم پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ شعر کی زبان روایتی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں استعارے تمثیل وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ مگر ہر وہ بات جو غیر روایتی ہو یا الگ ہو وہ شعر نہیں ہو سکتی۔ شعر کیلئے غیر روایتی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں جمالیات ہو، معنی آفرینی ہو، جس میں کوئی چونکا دینے والی بات ہو اور جو قاری کی حس جمالیات پر اثر انداز ہو وہ شعر ہو سکتا ہے۔ حس جمالیات کی تفہیم کیلئے انگریزی لفظ "استھیٹکس" استعمال ہوتا ہے۔ جس سے مراد حسن اور فن کا امتزاج ہے۔ اور یہ کسی انسان کی پانچ حسیات کے علاوہ حس ہے یا پھر ان کا امتزاج۔

علی اکبر ناطق نے اپنی کتاب میں " شعر کا عوام سے ربط اور شاعر کی مشکلات " کی جو تعریف بیان کی ہے وہ حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" میں "لارڈ مکالی" کی شعر کی تعریف سے مستعار لی ہے۔ دونوں نقادوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

حالی اپنی تنقید کی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں "شعر کی ماہیت" بیان کرتے ہوئے "لارڈ مکالی" شعر کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا، ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور۔ بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعر کی کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈینٹی جیسے صناع بھیان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اتار سکتے جیسا مو قلم اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اتر تا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے۔ اس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی اور نہ ناٹک کی۔ مصوری اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جس قدر کہ چہرہ بارنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بو قلمون کی کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرت انسانی معاشرت نوع انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقتہ موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیا کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں

محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے۔ جس قدر خیال کی قلمرو۔"(۹)

علی اکبر ناطق نے اپنی کتاب "ہیئت شعر" میں "شعر کا حواس سے ربط اور شاعر کی مشکلات" کے نام سے ذیلی مضمون میں جو لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو:

"ایک شاعر کو ایک مصور، ناول نگار، معمار اور نقاد کی نسبت کہیں زیادہ قوت ممیزہ سے کام لینا پڑتا ہے اور تخیل کو قوت ممیزہ کے بھی کرنا ہوتا ہے کہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس بنا پر اس کا سامان بھی نہایت محدود، کمیاب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی فقط احساس کی حد تک، کیونکہ ایک مصور کو تصویر بنانے کے لیے موئے قلم، رنگ اور کپڑے یا کاغذ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ ناول نگار کو کاغذ درکار ہیں۔ معمار کو اپنے اوزار کے ساتھ ساتھ سامان تعمیر کی ضرورت ہے کہ ان کے بغیر معمار کو فنکاری دکھانا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ اسی طرح اداکار کو باقاعدہ اس آرٹ یا تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کو بنیاد بنا کر اداکاری کے جوہر دکھا سکے مگر شاعر کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ اسے صرف اور صرف الفاظ کی ضرورت ہے، جن کا مادی طور پر اکٹھا کرنا ضروری نہیں۔ چنانچہ شاعر کو کسی بھی مادی وجود کے بغیر صرف الفاظ کے ساتھ وہ تمام صورتیں پیدا کرنی ہیں، جو اول الذکر فنکار اپنے مادی اوزاروں کے ذریعے پیدا کرتے ہیں، یعنی ایک شاعر کو تصویر بنانا ہے تو لفظوں کے ساتھ، عمارت کھڑی کرنا ہے، تو لفظوں کے ساتھ، اداکاری اور کہانی بھی الفاظ ہی کے ساتھ کرنا اور اور کہنا ہوتی ہے۔ وہ ان الفاظ کو مخصوص استعاروں میں بدل کر، مخصوص اوزان میں ترتیب دیتا ہے اور قاری یا سامع کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ان حالات میں شاعر اکیلے شخص کو وہ تمام حسیات بروئے کار لانا پڑتی ہیں، جو دوسرے فنکاروں کے لیے الگ الگ

استعمال ہوتی ہیں۔ یوں شاعر کے لیے بہت سی چیزیں ضروری ہو جاتی ہیں اور
اس پر بہت ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ایک بڑا اور جینوئن شاعر،
پینٹنگ کے اصولوں سے بھی واقف ہوتا ہے، موسیقار بھی ہوتا ہے، معمار
بھی، ناولسٹ اور نقاد بھی ہوتا ہے۔"(۱۰)

اس سے آگے وہ حالی سے کچھ مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ناطق کا کہنا ہے کہ شاعر کے لیے تخیل، صفحہ فطرت کا مطالعہ اور الفاظ پر قدرت ضروری ہے مگر صرف ان تین چیزوں کی بدولت اچھا شاعر بننا ممکن نہیں۔ شاعر کے لیے اور بہت کچھ بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ناطق نے مشہور مغربی مفکرین کی آراء کی روشنی میں شعر کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جن میں ڈاکٹر جانسن، الفریڈ آسٹن، نیچر اینڈ ایلیمنٹ آف پوئٹری، سی ایم گیلے، جے کور تھوپ، شامل ہیں۔ مگر ناطق نے ان تمام کے ہاں شعر کی تعریف کو غیر واضح اور مبہم قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناطق نے چند مشرقی مفکرین کی آراء میں شعر کی تعریف پیش کی۔ مگر بقول ناطق شعر کی واضح تعریف بہر حال نظر نہیں آئی تو انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شعر کی تعریف کی۔ ناطق نے شعر کو ریشم کی پوٹلی کہا ہے جس کی اوپری سطح جاذب نظر ہے اور کبھی اندر موتی ہیں تو کبھی کچھ اور۔ پوٹلی کی بیرونی سطح ردیف قافیہ سے مزین ہے۔ اور اندر چھپے ہوئے معانی موتیوں کی مانند ہیں جنہیں اہل علم یا اہل ذوق ہی ٹٹول کر ان کی اصلیت کا سراغ لگاتے ہیں۔ اوپر سے خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کے اندر بھی جاذبیت اور دل آویزی ہونی ضروری ہے۔ اب شعر کی اندرونی و بیرونی خوبصورتی کا تعین کیسے ہو گا یا کسی قبر پر لکھی تحریر بھی اگر جاذب اور خوبصورت ہو تو وہ شعر کہلا سکتی ہے؟ یا وہ اشعار جو قاری پر اپنا امیج نہیں چھوڑتے ان ناقص اشعار کی کیا خامیاں ہوتی ہیں۔ ناطق کے خیال میں کوئی نظم یا تحریر اگر مناسب ٹریجڈی ہے اور کلام موزوں ہے تو وہ شعر کہلائے گا خواہ وہ قبر پر لکھی تحریر ہو۔ اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا علی اکبر ناطق نے شعر کی تعریف میں کوئی نئی بات یا دلیل لے کر آئے ہیں یا انہوں نے بھی وہی پرانی بات نئے انداز سے کی؟ اصل میں شعر کی باقاعدہ تعریف پر ابھی تک کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔ تمام نقاد اسے اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ کسی کے ہاں شعر وہ ہے جو قضیائے تخلیہ سے وجود میں آئے۔ یا پھر جو کلام موزوں ہو اور پر ترنم الفاظ پر مبنی ہو وہ شعر کہلاتا ہے۔ کسی کے ہاں شعر کو وزن کی ضرورت نہیں۔ بلکہ حالی نے بھی "مقدمہ شعر و شاعری" میں یہی کہا ہے کہ شعر کو شعر ہونے کے لیے وزن کی

ضرورت نہیں۔ جب کہ مولوی نجم الغنی کے ہاں شعر کے تین کردار وزن، قافیہ، قصد ہیں۔اس کے علاوہ ہر نقاد کے ہاں شعر کی تعریف میں الگ الگ نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شعر کی کوئی واضح اور مدلل تعریف ابھی تک سامنے نہیں آ سکی۔ شعر کے بعد ناطق کے ہاں اگلا مضمون "اسلوب" ہے۔ تیسرے حصے میں اسلوب پر بحث کرتے ہوئے ناطق نے سب سے پہلے "سید عابد علی عابد" کی کتاب "اسلوب" سے اقتباس پیش کیا اور اس کے اس نتیجے پر پہنچے کہ عابد علی عابد نے اسلوب کی جو تعریف پیش کی ہے وہ غیر واضح اور غیر تسلی بخش ہے۔ اس کے بعد ناطق نے "گوپی چند نارنگ" کی کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" میں اسلوب کی جو تعریف بیان ہوئی ہے اس کو بھی روایتی اور غلط فہمی قرار دیا ہے۔ یہاں ہم چند بڑے نقادوں کے ہاں اسلوب کی تعریف کا موازنہ ناطق کی اسلوب کی تعریف سے کریں گے۔

سید عابد علی عابد اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے معتبر ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔اگر اپ اس بات کی مشق کرتے ہیں کہ آپ بوجھیں کہ یہ شعر یا نثر کا ٹکڑا کس نے لکھا تھا تو آپ بتدریج اتنے مشاق ہو جائیں گے کہ انیس و دبیر، غالب اور ذوق، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے کلام میں تمیز کر سکیں یا حالی، سرسید اور غالب کے نثر پاروں میں ان کی انفرادیت دیکھ سکیں۔"(۱۱)

سید عابد علی عابد کی اسلوب کی تعریف کے بعد ہم گوپی چند نارنگ کے ہاں اسلوب کی تعریف دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" میں لکھتے ہیں:

> "پس اسلوب کے قدیم اور جدید تصور یعنی اسلوبیات کے تصور میں پہلا بڑا فرق یہی ہے کہ اسلوبیات کی رو سے اسلوب کی حیثیت ادبی اظہار میں اضافی نہیں بلکہ اصلی ہے، یعنی اسلوب لازم ہے یا ادبی اظہار کا ناگزیر حصہ ہے جس کے

ذریعے زبان ادبی اظہار کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یعنی ادبی اسلوب سے مراد
لسانی سجاوٹ یا زینت کی چیز نہیں جس کا رد یا اختیار میکانکی ہو، بلکہ اسلوب کی
نفسہ ادبی اظہار کے وجود میں پیوست ہے۔" (۱۲)

علی اکبر ناطق کے کے ہاں ان دونوں نقادوں کی تردید نظر آتی ہے۔ ناطق نے اسلوب کی تعریف سمجھانے کے لیے "لفظ معنی" "لفظ اسم" اور "حروف" کو اسلوب کے اہم ستون قرار دیا۔ شاعر یا تخلیق کار کے ہاں الفاظ کی نشست و برخاست اور حروف کا محتاط طریقے سے استعمال ہی اس کا اسلوب بناتا ہے۔ جب تک کوئی تخلیق کار ان تمام عوامل کا سہی استعمال نہیں جان سکتا تب تک وہ اسلوب کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ناطق نے اسلوب اور جمالیاتی اسلوب کو جوڑتے ہوئے جمالیاتی اسلوب کو اسلوب کی ہی خوبصورت اور آراستہ شکل کہا ہے۔ یعنی جمالیاتی اسلوب میں تخلیق کار اپنی تخلیق کو سجا سنوار کر پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ "لفظ کی ہیئت" پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ لفظ شعر کا ظرف ہیں۔ لفظ کو متحرک قرار دیتے ہوئے ان کا ماننا ہے کہ کوئی لفظ زبان دان کی برسوں کی کیفیات اور تجربات ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار کوئی لفظ استعمال میں لاتا ہے تو وہ اس کے الگ اور انوکھے معنی وا کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ ذہنی کیفیت بدل دیتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کے الگ طریقے سے استعمال کرنے پر وہ لفظ الگ الگ رنگ بکھیرتا ہے۔ لفظ پر بحث کرتے ہوئے "شعر اقبال کی جمالیاتی ساخت" میں ناطق نے اقبال کے ہاں لفظ کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے ہاں کتنا لفظی سرمایہ موجود ہے اور اس کے ماخذ کیا ہیں۔ لفظوں کی نشست و برخاست، رنگ، ہیئت اور استعمال کس طرح اقبال کو باقی شاعروں سے جدا کرتا ہے۔ ناطق نے اقبال کی نظم کے بند پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ اسی طرح کئی نظموں کے بند اٹھائے اور ان کے الفاظ و تراکیب پر روشنی ڈالی۔ مگر ناطق کے ہاں بھی کچھ منفرد نظر نہیں آتا۔ ناطق نے اقبال کی شاعری میں الفاظ و تراکیب کے جو مباحث چھیڑے ہیں اور ان سے جو نتیجے اخذ کیے ہیں وہ ہمیں اس سے پہلے دوسرے بہت سے نقادوں کے ہاں مل جاتے ہیں۔ سید وقار عظیم کی کتاب "اقبال معاصرین کی نظر میں" میں اقبال کی شاعری میں استعارے اور جدید لفظوں کے استعمال پر بات کی گئی ہے۔

"لیکن اقبال کو ابتداء جو کامیابی ہوئی اس کی وجہ زبان اور جذبات کی لطافت و نزاکت ہی نہیں بلکہ ان کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو میں مئوثر استعارے اور فارسی اور پنجابی اور ہندوستان کی دوسری بولیوں کے الفاظ داخل کر کے اس زبان کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اردو کو نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔"(۱۳)

اس کے بعد شعر کے نزول پر بات کرتے ہوئے ناطق کہتے ہیں اقبال کا سارا کلام کسی صورت الہامی نہیں ہو سکتا۔ کچھ ناقدین کے ہاں یہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ اقبال کو آفاقی والہامی شاعر قرار دیتے ہیں۔اور ولی بنانے پر تل جاتے ہیں مگر ناطق نے یہ بات واضح کی ہے کہ ایک شاعر کو کوئی بھی خیال ابہام کی شکل میں ملتا ہے اور یہ شاعر ہی ہے جو اس خیال کو اپنی فنی مہارت اور تخیل کی بلند پروازی سے خوبصورت لفظوں کا جامہ پہناتا ہے استعارے کے موتی ٹانکتا ہے اور شعر کو شکل دیتا ہے۔اقبال نے بھی اسی محنت سے اپنے کلام کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔اس کے بعد ناطق نے اقبال کی شاعری میں استعارے کا استعمال اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔اقبال کے ہاں استعارے کا اس قدر خوبصورت استعمال ہے کہ شائد ہی کسی اور شاعر کے ہاں نظر آئے۔

علی اکبر ناطق چونکہ خود ایک شاعر ہیں اور وہ شعر کے لیے استعارے کو بنیادی اکائی قرار دیتے ہیں۔ناطق نے اس بات کا اظہار اپنی اس کتاب میں بھی کیا اور دوسری کتب میں بھی۔ ناطق کی اپنی غزل میں خفی رعایات اور استعارات کا خوبصورت استعمال نظر آتا ہے۔ ناطق کے مطابق خفی رعایات، استعارات اور الفاظ کی صوتی ہم آہنگی کسی کلام کا خاصہ ہیں۔افتخار عارف ناطق کی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"علی اکبر ناطق کی ایک بڑی خوبی اس کے لفظوں میں استعمال ہونے والے حرفوں اور لفظوں کے اندر خفی رعایتوں کی بڑی بڑی کہانیاں ہیں، جنھیں اگر کھولیں تو ہزاروں سال سے تاریخ میں پیدا ہونے والے واقعات کی گتھیوں سے لے کر ثقافتوں کے قفل ابجد ہیں، کھولتے جایئے اور زمانے دیکھتے جایئے مگر اس کے لیے آپ کو شعر فہمی کی عمیق گہرائیوں میں اترنا ہو گا۔ وہیں ان حرفوں

اور لفظوں کے درمیان دوڑتی ہوئی موسیقی ہے کہ دل گنگنانے لگتا ہے۔اس کا ذائقہ بالکل جدا ہے،یہ رس،یہ ترنم،جو مصرعوں میں تقسیم و تراکیب کے ساتھ اس کے صوتی نظام کو برقرار رکھتی ہے،مربوط بھی رکھتی ہے اور درجہ بدرجہ آگے بھی بڑھاتی ہے۔یہ ہنر وری معرے لیے ناطق کے ہنر کا سب سے بڑا کمال ہے۔"(۱۴)

ناطق نے اقبال کے استعاراتی نظام پر بات کرت ہوئے کہا ہے اگر کوئی شاعر اپنی شاعری میں استعارہ استعمال نہیں کرتا تو اس کی شاعری شاعری نہیں بلکہ نثری گفتگو ہے۔اس کے ساتھ ہی ناطق نے اقبال کی کچھ اردو غزلیں بطور مثال سامنے رکھیں جن میں اقبال نے استعارے کا اس قدر جدید اور خوبصورت استعمال کیا ہے کہ کوئی بھی پڑھنے والا اقبال کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ناطق نے اقبال کی نظم کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح

اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

نظم کے ان اشعار میں تراکیب استعارات سے اس خوبصورتی سے سجایا گیا ہے کہ کوئی بھی مصرع خالی نہیں۔ان مصرعوں میں ایسی تصوعر کشی کی گئی ہے کہ ایک ایک مصرع ایک ایک منظر سامنے رکھ دیتا ہے۔اقبال کے ہاں ایسا نیا اور جاندار استعارہ ملتا ہے کہ کوئی دوسرا شاعر اس پائے کا استعارہ تصور نہیں کر سکتا۔اقبال کا یہ خاصہ ہے کہ وہ استعارہ استعمال

کرتے ہوئے اسے ابہام اور پیچیدگی سے پاک رکھ کر اپنے کلام کو پیچیدہ نہیں ہونے دیتے۔ اقبال کے ہاں ہمیں استعارے کی تمام اقسام دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اقبال کے استعاراتی نظام کے بارے میں ڈاکٹر سید صادق علی رقمطراز ہیں:

"اقبال کے کلام میں جو متحرک فضا نظر آتی ہے،وہ ان کی فکر کا ان کے استعاراتی نظام کے ساتھ شیر و شکر ہو جانے کا نتیجہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے استعارات جہاں ایک طرف تصویر آفرینی،پیکر تراشی اور آرائش کلام کا شاعرانہ حق ادا کرتے ہیں،وہیں وہ معنی آفرینی اور لسانی توسیع کا بھی اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اقبال کے استعاراتی الفاظ و تراکیب نے معانی کی نئی جہات روشن کی ہیں جن کے سبب اقبال کی زبان دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع معنوں کی حامل ہو گئی ہے۔"(۱۵)

اقبال کی شاعری میں استعارے پر بحث کرتے ہوئے ناطق نے میر اور غالب کے ہاں استعارے پر بھی روشنی ڈالی۔ میر کے ہاں ثقافتی استعارہ پایا جاتا ہے اور غالب کے ہاں فارسی ایرانی استعارے نظر آتے ہیں۔ جب کہ اقبال کے ہاں عرب ثقافت سے جڑے استعارے پائے گئے ہیں۔ وہ عرب کے صحرا اور راہگزر کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ اقبال کے ہاں میلے ٹھیلے، کھیت کھلیانوں کی بجائے ناقہ، صحرا، محمل، سرخ و کبود بدلیاں، خیمہ، ٹوٹی ہوئی طناب، قرطبہ، شام و فلسطین، حجاز، یمن، کوفہ و نجف وغیرہ کا استعمال زیادہ پایا گیا۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں

کہ میں آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

فریب خوردہ منزل ہے کارواں ورنہ

زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل

نظر نہیں تو مرے حلقہء سخن میں نہ بیٹھ

کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو

ترے لیے ہے مرا شعلہ نوا قندیل

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم

نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

اقبال کے ہاں عرب کے استعارے کثرت سے ملتے ہیں۔ اقبال کا مرد مومن، خودی کا تصور، اسلامی تاریخ کا ذکر کسی نہ کسی طرح ان کی شاعری میں آجاتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں زندگی کے اطوار اور معاملات کو اقبال نے شعری کا حصہ بنایا۔ اقبال کے خیال میں اسلامی طرز زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں بھی عرب کا ذکر کیا۔

"I therefore demand the formation of a consolidated muslim state in the best interest of india and islam.For india it means security and peace resulting from an internal balance of power; for islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian imperialism was forced to give it,to mobilize its law,its education,its culture and to bring them into close contact with its own original spirit and with the spirit of modern times"(۱۱)

ناطق نے اقبال کے شعر کی ہیئت اور جمالیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے فکری اور فنی تحرک کو اس کی شاعری کی روح قرار دیا ہے۔ انجماد موت کی جبکہ حرکت زندگی کی نشانی ہے اور معلمین کی نظر میں دو طرح کی حرکت ہوتی ہے ایک طبعی اور دوسری فکری و تخیلاتی حرکت۔ اقبال وہ شاعر ہے جس نے اپنی پوری شاعری اسی درس میں وقف کر دی کہ جمود موت

ہے اور حرکت زندگی۔ اقبال کا خودی کا فلسفہ ہو یا مرد مومن کا فلسفہ وہ اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ انسان مایوس ہو کر بیٹھ جائے تو اسے کسی طرح کا کوئی حل نہیں ملتا مگر وہ جستجو کرتا رہے تو بہت سے راستے اس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ فکری حرکت، جستجو، اضطراب اسی کا نام ہے جو اقبال کی شاعری میں ملتا ہے۔

مضطرب رکھتا ہے مرا دل بے تاب مجھے

عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے

موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے

ہو نہ زنجیر کبھی حلقہء گرداب مجھے

آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا

خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

موج دریا از بانگ درا

اس سلسلے کی بہت سی نظمیں اقبال کی فکری حرکت کا ثبوت ہیں۔ وہ سمندر، صحرا، میدان، خلاء، زمین آسمان کو مسخر کرنے کی بات کرتا ہے۔ وہ جمود کا قائل نہیں تھا اقبالکے ہاں مسلسل حرکت نظر آتی ہے اور حرکت ہی ارتقاء کا نام ہے۔ ناطق نے اقبال کے فکری ارتقاء کو رومانوی اور اساطیری حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے ہاں یاسیت اور ماضی پرستی نظر نہیں آتی بلکہ اقبال وہ شاعر ہے جسے خوشی، نشاط، اور انبساط چاہئے۔ فن کا تغیر اور ارتقاء جس سے خوشی کشید ہو۔ ناطق کے خیال میں ایک شاعر کی منطق رومانی ہوتی ہے وہ کبھی سائنٹفک پیانے پر نہیں سوچ سکتا نہ ہی دلیل اور وضاحت کے ساتھ چلتا ہے۔ ناطق کے خیال میں اقبال شروع میں صرف شاعر ہے وہ ناصح نہیں ہے نہ اسے ان چیزوں سے سروکار ہے۔ شاعر جسے اپنی معراج کا ادراک کرنا تھا۔ اس نے سخن میں ارتقائی منازل طے کیں۔

"محمد اقبال نے جب بھی فنون لطیفہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ تن آسانی، خود فراموشی اور غلامانہ ذہنیت کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے انہیں فنکار اور فنون لطیفہ دونوں کے لیے ہمیشہ سم قاتل سمجھا ہے۔"(۱۷)

ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال نے بھی اساطیر سے تعلق جوڑا ہے۔ اقبال نے ماضی کی اسلامی تاریخ سے کچھ استعارے بنائے اور ان پیغمبروں اور تاریخی ہیرو کے کرداروں کو جمالیاتی رومانس کے ساتھ پیش کیا۔ ناطق نے اساطیر کو شاعری کا ستون قرار دیا ہے اور اگر ناطق کی اپنی نظمیں دیکھی جائیں تو ان میں بھی مذہبی تلمیحات اور اساطیری رنگ موجود ہے۔

"علی اکبر ناطق جواں سال ہے اور جرات مند ہے۔ زیر نظر مجموعے میں ہم ایک شاعر کے بیدار، متجسس اور بے خوف ذہن سے روبرو ہوئے ہیں جس کی تخلیقی قوتیں قابل رشک ہیں۔ ان میں سے بعض نظموں کا اساطیری ماحول اور تاریخی شعور موجودہ زمانے کے ساتھ عمدگی سے پیوست ہو جاتے ہیں"(۱۸)

ناطق نے اقبال کے شعری نظام کو فطرت اور اساطیر سے جوڑا ہے۔ اقبال قدرتی مناظر کے عشق میں جمالیاتی اساطیر کی روشنی میں شاعری کرتے ہیں۔ وہ ایک پہاڑ کی بلندی کا سہارا لیتے ہوئے "ہمالہ" سے مخاطب ہوتے ہیں اور اسے رومانوی اور جمالیاتی اساطیر بنا دیتے ہیں اور تلمیح کے موتی ٹانکتے ہیں۔

اے ہمالہ، اے فصیل کشور ہندوستاں

چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

نوجواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے

تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن

وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن

تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمہء دامن ترا آئینہء سیال ہے

دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

ان دو بند میں اقبال کا فطرت کے ساتھ تعلق اور اس کے جدید استعارے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس نظم "ہمالہ" میں اقبال کے خیال کی بلندی بھی دیکھی جا سکتی ہے اور شاعری کا ارتقاء کی طرف گامزن ہونا بھی نظر آتا ہے۔ اقبال کی پرواز زمیں سے اٹھتے ہوئے آسمان کی طرف جارہی ہے اقبال نے زمینی استعارے چھوڑ کر آسمانی استعارے جیسے " برق تجلی، طور سینا" کی اساطیری مماثلت اختیار کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اقبال کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے تمام کلاسیکی پیرائے اظہا کے کامیاب اور فنکارانہ استعمال سے ان کے فنی امکانات مین مزید وسعت پیدا کی۔ چنانچہ غزل، مخمس، مسدس، رباعی، قطعہ، مستزاد اور ساقی نامہ ان سب سے اس امر کی توثیق ہع جاتی ہے۔ وسعت مطالعہ کی بنا پر اشعار میں تلمیحات، تاریخی حوالوں، قرآنی آیات، اور قدیم شعرا کے اشعار کی تضمین سے اگر ایک طرف مفہوم میں گہرائی پیدا کی تو دوسری طرف تاثر میں اضافہ ہوا۔ تراکیب تراشی اسلوب کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ غالب کے بعد اردو کے دوسرے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے نت نئی تراکیب سے زبان کے حسن میں

اضافہ کیا۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے بے شمار ایسے الفاظ بھی خوبصورت اور شاعرانہ طریقے سے استعمال کیے جو بالعموم شاعرانہ لغت سے خارج تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر مشرقی اور قدیم تنقید کے معیار پر کلام اقبال کا جائزہ لیں تو صنائع وبدائع کی جملہ اقسام مل جاتی ہیں۔"(۱۹)

ناطق نے اقبال کے فن کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جن پر بہت سے نقاد پہلے بات کر چکے ہیں مگر ناطق نے اس کام کے لیے نیا طریقہ اختیار کیا اور اقبال کی شاعری میں موجود فلسفے اور فکر کو اپنے فکری عمل سے گزار کر اس کی تہیں کھولیں۔ اقبال کے سالنامے پر غور کیا اور اس کے بعد اقبال کی کچھ ایسی نظمیں جیسے "شاعر" اور "جواب خضر" کا فکری جائزہ لیا۔ جن میں اقبال نے متحرک زندگی اور تغیر فکر کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی اقبال کی نظم "زندگی" کے فنی اور فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اقبال کے خودی کے تصور پر بحث کی اور اقبال کی طبیعت کے انتشارات کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ناطق کے خیال میں اقبال ایک عام انسان تھا اور اس کی خواہشات اور ضروریات بھی ایک عام انسان جیسی تھیں مگر اس کے برعکس اقبال کی شاعری میں خودی اور مرد مجاہد کا فلسفہ اور اقبال کو ولی سمجھنے والوں سے سوال کیا کہ ایک انسان اور ولی میں فرق موجود ہے۔ اقبال کوئی راہب یا فقیرانہ طبیعت کے انسان نہیں تھے بلکہ سماجی زندگی گزارنے والے ایک عام انسان تھے۔ اقبال کو بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا اور وہ راگوں سے آشنا تھے۔ اقبال کا ایک شعر اس سلسلے میں دیکھا جاسکتا ہے:

لوگ کہتے ہیں مجھے، راگ کو چھوڑو اقبال

راگ ہے دین مرا راگ ہے ایماں مرا

اس شعر سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال کو موسیقی سے کتنا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ اقبال کی ایک نظم "نصیحت" اس حوالے سے دیکھی جاسکتی ہے۔

مکّا نے اقبال سے ازراہِ نصیحت یہ کہا

عامل روزہ ہے تو نہ پابند نماز

تو بھی ہے شیوہ ارباب ریا میں کامل

دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکر حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے

ترا انداز تملق بھی سراپا اعجاز

ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے

فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز

در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود

پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے

پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز

نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن

اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پرور ترے ملک کے اخبار بھی ہیں

چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے

تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز

(نصیحت)

ناطق نے اقبال کی نظموں کے کچھ حصے درج کیے اور اس پر ترتیب سے بحث کی۔ ناطق نے اقبال اور رومی کا تعلق خوبصورتی اور جامع انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے رومی اور اقبال کے زمانے کی روشنی میں ان کے کلام کی وسعت اور تخیلاتی فکر پر روشنی ڈالی۔ اقبال کا فلسفہ خودی جو کہ اقبال کا خاصہ ہے اس کے بنیادی نقوش بھی رومی سے ملتے ہیں۔ عقل کی آفرینش، رجعت الی اللہ، عقل اور عشق، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، جبر وقدر کا فلسفہ اقبال اور رومی دونوں کے ہاں مشترک ہے۔ اس کے بعد ناطق نے اقبال کی نظم "پیر و مرید" جو ان کے مجموعے "بالِ جبریل" میں ہے درج کی اور اس کی تفہیم کی۔ اقبال نے اپنی فکر کی ارتقائی منازل طے کیں اور رومی کے نظریے کو تقویت دیتے ہوئے مکمل کیا۔ ۱۹۳۲ کے بعد اقبال کی پختہ فکر اور پختہ نظریات کی حامل ایک نظم درج ذیل ہے:

"خودی کا سرِ نہاں لا الہٰ الا اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الہٰ الا اللہ

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں لا الہٰ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا

فریب سود و زیاں لا الہٰ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند

بتان وہم و گماں لا الہٰ الا اللہ

ر دہو لی ہے زمان و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہٰ الا اللہ

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الہٰ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذاں لا الہٰ الا اللہ

(لا الہٰ الا اللہ)

ناطق نے اقبال کی نظم "جبریل و ابلیس" پر سیر حاصل بحث کی۔ اقبال جستجو کی تلقین کرنے والا شاعر ہے اور ہر حالت میں ہمت اور محنت کا پرچار کرتا ہے۔ اس نظم میں بھی اقبال نے ابلیس کی طرف سے جو کلمات کہے وہ غور طلب ہیں۔ اس نظم میں تلاش حق، تلاش عشق، جستجو، خودی کا تصور ایک ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اقبال کی طویل نظم "ساقی نامہ" پر بحث کی۔ اقبال کے ہاں عرب ثقافت اور عربی الفاظ اس خوبصورتی اور بے باکی سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان الفاظ کو خالص عربی میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر محمد منور اپنی کتاب "میزان اقبال" میں لکھتے ہیں۔

> "مضامین کے علاوہ اقبال کے کلام میں ایسے الفاظ بھی کثرت سے مل جائیں گے جنہیں وہ کبھی کبھی ٹھیٹھ عربی معنی میں استعمال کرتے ہیں مثلاً دلیل کو راہبر کے معنی میں، ادیب کو مودب اور اتالیق کے معنوں میں، طلب کو تعاقب کے معنوں میں، غریب کو نادر کے معنوں میں، زحمت کو گھٹن کے معنوں میں؛ زحمت کا استعمال دیکھئے، موج دریا میں کہا ہے

زحمت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں

وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

"یہاں اگر زحمت کے عام معنی ـــ کلفت ـــ مراد لیے جائیں تو وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو مُتن سے ہوتا ہے ـــ مصرع تو "کلفت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں" بھی ہو سکتا تھا۔ مگر زحمت میں جو بھرپور معانی نہاں ہیں وہ کلفت میں کہاں۔"(۲۰)

علی اکبر ناطق چونکہ خود ایک نظم کے شاعر ہیں اور وہ بھی اساطیر سے اپنا تعلق جوڑتے ہوئے فن کی معراج پر پہنچتے ہیں۔ ہم اقبال اور ناطق کی کچھ نظموں کا تجزیہ کریں گے اور ان میں فنی و فکری مماثلت تلاش کریں گے جس کی بنا پر ایک شاعر دوسرے شاعر پر تبصرہ کرتا ہے اور تنقید کے باب میں ایک مکمل کتاب لکھ دیتا ہے۔

ناطق بھی اساطیری رنگ میں رنگی ہوئی نظمیں لکھتے ہیں اور عرب و عجم کو اپنی شاعری کا حصہ بنا چکے ہیں۔ ناطق کی مشہور نظم "سفیر لیلیٰ" جو ۴ حصوں پر مشتمل ہے عرب کی ثقافت بیان کرتی ہے اور اقبال کے ہاں بھی ایسی لاتعداد نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اساطیر کے حوالے سے بھی اقبال کی بے شمار نظمیں ہیں اور ناطق نے بھی بے شمار نظمیں لکھیں۔ اس سلسلے میں ناطق کے ں ظموں کے مجموعے "ریشم بنتا کھیل نہیں" میں ان کی نظم کلیسا، جو طور سینا سے لوٹ آئے، عصا بیچنے والو، سفیر لیلیٰ، مدینے کا قصہ، ریت کے ٹیلے، زیتونوں کا باغ، پرانے گنبد، اہم ہیں۔

علی بن محمد تمھیں یاد ہو گا مدینے کا قصہ

یکا وہ مدینہ، جسے اس کے بانی نے شہر محبت کہا تھا

یہاں اک شریفوں کا گھر

ملا تھا ان کا ورثہ

غریبوں کا گھر تھا خدا کی طرف سے زمانے پہ آیت

علی بن محمد تمہیں یاد ہو گا

یہ نبیوں کا کنبہ، فرشتوں کا ماوٰی

زمیں پر خدا کی امانت، عدالت کے بانی، شرافت کی [illegible]

زمانے پہ لازم تھی ان کی مودّت

مگر تم نے دیکھا علی بن محمد

مودّت کی مرکز محمد کے حوض شرافت کی کوثر

محمد کی عزت

کسی بد نصب کی شقاوت کی زد میں

شکستہ در و بام کے درمیاں سے بلاتی رہی تھی

ابوذر کہاں ہو؟ علیؑ کو بلاؤ

مدینے کے اطراف میں اس کنویں کھودنے والے مزدور کو تم بلاؤ

فدک جس کی میراث ہے اس غنی کو بلاؤ

ابوذر انہیں کہنا تیشے کو رکھ کر بہت جلد گھر کی خبر لے

وہی گھر، جسے حادثوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کھانے لگی ہے

شریفوں کا گھر تھا خدا کی طرف سے زمانے پہ آیت

علی بن محمدؐ تمہیں یاد ہو گا

یہ سخیوں کا کنبہ، فرشتوں کا ماویٰ

زمیں پر خدا کی امانت، عدالت کے بانی، شرافت کی محکم دلیلیں

زمانے پہ لازم تھی ان کی مودّت

مگر تم نے دیکھا علی بن محمدؐ

مودّت کی مرکز محمدؐ کے حوض شرافت کی کوثر

محمدؐ کی عزت

کسی بد نصب کی شقاوت کی زد میں

شکستہ در و بام کے درمیاں سے بلاتی رہی تھی

ابوذر کہاں ہو؟ علیؑ کو بلاؤ

مدینے کے اطراف میں اس کنویں کھودنے والے مزدور کو تم بلاؤ

فدک جس کی میراث ہے اس غنی کو بلاؤ

ابوذر انہیں کہنا تیشے کو رکھ کر بہت جلد گھر کی خبر لے

وہی گھت، جسے حادسوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کھانے لگی ہے

ابوذر علیؑ کو بلاؤ

مضافِ مدینہ مین جو اور زیتون کے بدلے

کھجوروں کے باغوں کو سیراب کرتے ہوئے فتح مرحب و عنتری کو بلاؤ

کہو آج تیرے اسی گھر پہ بلوہ ہے

جو آسیہ اور مریم کے پردے کا ضامن

فرشتوں کا فرش زمیں پر اکیلا سہارا

وہی گھر

مسلسل جہاں آیتوں کی تلاوت میں بھاری پڑوں

کو گھماتے ہوئے نور کے ہاتھ

پستے ہوئے جو کی آواز مین قدسیوں کی سلامی

محمدؐ کے دشمن یہاں آگ اور لکڑیاں لے کے آئے

ابوذر

محمدؐ کے وارث کو جلدی خبر دو

کہ حیدرؑ! حسینؑ و حسنؑ اور محمدؐ کی بیٹی کو

اولادِ ابلیس کے شر سے آکر رہائی دلاؤ

محمد کے گھر کو بچاؤ

(مدینے کا قصہ)

ناطق نے اپنی کتاب "هیئت شعر" کے آٹھویں مضمون "حیات اقبال کی کہانی غلام بھیک نیرنگ کی زبانی" میں ایک کردار غلام بھیک نیرنگ جو کہ اپنی اقبال سے جان پہچان اور ملاقاتوں کی کہانی بیان کر رہا ہے کے نام سے لکھا۔ اس مضمون میں غلام بھیک نے بتایا کہ کس طرح انہوں نے ۱۹۹۵ میں پنجاب یونیورسٹی کا انٹرنس پاس کیا اور انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کی ملاقات اقبال سے ہوئی۔ انہوں نے اقبال کی شعر و شاعری سے رغبت دیکھی اور اقبال کا کلام سننے کی حسرت کی۔ اس کے کلام پڑھنے اور سننے کے بعد وہ اقبال کے متعرف ہوئے۔ انہون نے اقبال کا متروک کلام بھی دکھایا جو کہ اقبال کو اس لیے ترک کرنا پڑا کیونکہ یورپ سے واپسی پر ان کا معیار سخن بہت بلند ہو گیا تھا اور بقول غلام بھیک اقبال کو وہ اشعار دیکھ کر شرم آتی تھی۔ کچھ شعر اور ایک قطعہ بھی درج کیا جو کہ اقبال نے ترک کر دیا۔

اقبال عشق نے مرے سب بل دیے نکال

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

غلام بھیک نے بورڈنگ کے تجربات بھی بیان کیے۔ ان کے بقول اقبال ایک ذہین طالبعلم تھے اور ان کا کمرہ نیچے کی منزل میں مغرب کی طرف تھا۔ ان کے کمرے میں ہر وقت دوستوں کا رش لگا رہتا تھا۔ تمام ذوق والے دوست ان کے کمرے میں جمع رہتے تھے۔ اس کے بعد ان کی اقبال سے سیالکوٹ میں ملاقات ہوئی اور اقبال سے ان کی دوستی تھی۔ مخزن رسالہ جس کی وجہ سے اقبال کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اس کی تفصیل بھی بیان کی۔ پھر ۱۹۰۵ میں موسم گرما میں اقبال مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اور اقبال نے غلام بھیک کو ملنے کی تاریخ دی۔ اور دہلی میں اقبال ایک مزار کی حاضری پر ان کے ساتھ گئے۔ پھر یورپ سے واپسی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد انہوں نے لاہور میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی اور غلام بھیک کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بقول غلام بھیک اقبال نے ۱۹۱۵ میں مثنوی اسرار خودی شائع

کی تو ایک نسخہ انہیں بھی بھیجا۔ اس میں تصوف اور خواجہ حافظ پر جو سخت گیری تھی اس پر مجھے اعتراض تھا اور میں نے اقبال کو ایک طومار اختلاف لکھ بھیجا۔ اور خط میں یہ بھی لکھا کہ میں اس پر ایک مفصل مضمون شائع کروں گا۔ اس پر اقبال نے جواباً لکھا کہ ابھی آپ کچھ نہ لکھیں بلکہ مجھ سے تفصیلاً اس پر بات کریں میں نے پھر اقبال پر لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ مگر اس کے بعد اقبال کے ساتھ خط و کتابت جاری رہی۔ بقول غلام بھیک اقبال میں جذبہ تلاوت بہت زیادہ تھا اور ان کے کمرے سے تلاوت قرآن کی آواز آتی رہتی تھی۔

اس تمام مضمون میں اقبال کے دوست غلام بھیک نیرنگ نے جو کہانی بیان کی ہے ناطق نے وہ مضمون اپنی کتاب میں درج کر لیا مگر اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا کہ یہ مضمون انہوں نے کہاں سے لیا۔

خاتمہ:

اپنے اس باب کے خاتمے سے پہلے اس کتاب " ہئیت شعر " کا مطالعہ کرنے کے بعد کتاب اور علی اکبر ناطق کے بارے میں کچھ سوالات اور باتین جنم لیتی ہیں۔ کتاب کے شروع میں ناطق نے شعر کی تعریف میں مغربی مفکرین کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے شعر کی تفہیم کی مگر ناطق نے ان نقادوں کو کتاب میں شامل کیا جن کو مغربی تنقید مین بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ناطق نے ان نقادوں کو شامل نہیں کیا جن کا تنقید میں بڑا نام ہو اور ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہو۔ آگے جا کر ناطق نے انہیں نقادوں کی شعر کی تعریف کو رد کر دیا۔ مگر جب ایک نقاد کسی دوسرے نقاد کی کسی رائے یا تعریف کو رد کرتا ہے تو اس پر دوہری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ اپنا نظریہ دلیل کے ساتھ سچ ثابت کرے اور دوسرے نقاد کا نظریہ دلیل اور فہم کے ساتھ غلط ثابت کرے۔ مگر ناطق نے ایسا نہیں کیا۔ ناطق ایک شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار تو ہیں ہی اور وہ ان تمام اصناف میں خود کو منوا چکے ہیں۔ تنقید کی ان کی پہلی کتاب ہے اور انہوں نے اقبال کی شاعری پر تنقید کی جبکہ اقبال وہ شاعر ہے جس پر شائد سب سے زیادہ تنقید ہو چکی ہے۔ مگر ناطق کا کہنا ہے کہ وہ اقبال کے افکار و فن کی بجائے اس کے شعر کی ہئیت پر بات کریں گے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر انہوں نے بھی اقبال کی فکر و فن پر بات کرتے ہوئے وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے بہت سے نقاد کر چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ناطق اپنی تنقید کی ایک کتاب

جس میں اقبال کے بارے میں کچھ نیا لکھا گیا ہے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ناطق کی کتاب کا بیک فلیپ لکھا ہے اور انہوں نے اسے کامیاب کتاب قرار دیا ہے۔ وہ ناطق کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"ناطق نے اس کتاب میں تنقید کا ہئیتی انداز اختیار کیا ہے؛ شعری جمالیات کی وضاحت میں انھوں نے موضوع پر ہئیت کو فوقیت دی ہے۔ ایک خاص مفہوم میں تنقید کا یہ طریقہ کلاسیکی عربی و فارسی تنقید، اور سائنسی انداز میں، بیسویں صدی کے نصف اول میں، روسی ہئیت پسندی اور امریکی نئی تنقید میں رائج رہا۔ ناطق کے یہاں خود اپنی بات، اپنے ڈھب سے کہنے کی روش نہایت توانا ہے؛ وہ شائد ہی کسی نقاد سے اتفاق کرتے ہوں، مگر اختلاف و انکار کے بعد مدلل انداز میں، اور تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ وہ شاعری کی پہلے سے چلی آرہی چند مشرقی و مغربی تنقیدوں کو مسترد کرتے ہیں، اور شاعری اور اس کے ہئیتی و جمالیاتی عناصر کی تعریف خود متعین کرتے ہیں۔ یوں وہ نظری تنقید کی قلمرو میں قدم رکھتے ہیں۔"(۲۱)

حوالہ جات:

۱۔ فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۰۴) تعبیر کی شرح، کراچی، اکادمی بازیافت، ص ۹

۲۔ صدیقی، ظہیر احمد (س ن) تنقید و تحقیق ادبیات، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف فارسی جی سی یونیورسٹی، ص

۳۔ سرور، آل احمد (۱۹۶۸) تنقید کیا ہے، مشمولہ (شعور تنقید) لاہور، سنگ میل پبلیشنز، ص ۲۰

۴۔ عبداللہ، سید، (۲۰۰۲) اشارات تنقید، دہلی، کاک آفسٹ پرنٹرز، ص ۱۰

۵۔ احمد، کلیم الدین (۱۹۹۷) ادبی تنقید، مشمولہ (اردو تنقید منتخب مقالات) دہلی، ساہتیہ اکادمی، ص ۱۱

۶۔ رضوی، سجاد باقر (۲۰۰۲) مغرب کے تنقیدی اصول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ص ۲۷

۷۔ اختر، وحید (۱۹۹۷) تحقیق و تنقید، مشمولہ (اردو تنقید منتخب مقالات) دہلی، ساہتیہ اکادمی، ص ۲۲۹-۲۲

۸۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۶) ہیئت شعر، اسلام اباد، اسوہ کالج، ص ۹

۹۔ حالی، الطاف حسین (۲۰۰۹) مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، اسد نیئر پرنٹرز، ص ۳۳-۳۵

۱۰۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۶) ہیئت شعر، اسلام آباد، اسوہ کالج، ص ۱۵-۱۶

۱۱۔ عابد، علی عابد (۱۹۷۶) اسلوب، علی گڑھ، علی گڑھ بک ڈپو، ص ۴۳

۱۲۔ نارنگ، گوپی چند (۱۹۹۱) ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۳

۱۳۔ وقار عظیم، سید (۱۹۸۲) اقبال معاصرین کی نظر میں، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص ۲۰۶

۱۴۔ عارف، افتخار (۲۰۱۸) سبز بستیوں کے غزال، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۰

۱۵۔ صادق علی، سید (۱۹۹۴) اقبال کی شعری زبان، نئی دہلی، اے ون آفسیٹ پرنٹرز، ص ۵۵

۱۶۔ عبدالوحید، سید (۱۹۷۳) تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال، لاہور، ص ۱۷۳

۱۷۔ رحمن، شکیل (۱۹۹۳) محمد اقبال، نئی دہلی، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ص ۱۱

۱۸۔ ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) دست ہنر اور دیدہ بینا، مشمولہ (ریشم بننا کھیل نہیں) لاہور، سانجھ پبلیکیشنز، ص ۱۷

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر (۲۰۰۹) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۳۲

۲۰۔ منور، محمد (س ن) میزان اقبال، لاہور، آئیڈیل پرنٹنگ ورکس، ص ۴۴

۲۱۔ نئیر، ناصر عباس (۲۰۱۶) حیثیت شعر، اسلام آباد، اسوۂ کالج، ص ایک

ماحصل:

علی اکبر ناطق دور حاضر کے مایہ ناز شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ناطق کی شاعری کھو کھلی مدح سرائی اور سطحی پن سے دور ہے۔ ان کی شاعری میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیک کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ناطق نے بہت سے شعری اصناف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے مگر ناطق کی نظم میں اچھوتا پن ہے وہ ناطق کی پہچان بن گیا۔ ان کی نظم میں سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی رنگ نظر آتا ہے گویا وہ انسانی جذبات و کیفیات کے ترجمان ہیں۔ ان کی شاعری معنی آفرینی اور جدت خیال سے مزین ہے۔ ناطق کی نظم تلخ ہے جبکہ دوسری طرف ان کی غزل میں شگفتگی اور کلاسیکیت کا عنصر نمایاں ہے۔ ناطق نے غزل کو حقیقت کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا۔ یہی بات ناطق کو دوسرے شعراء سے الگ اور ممیز کرتی ہے۔

ناطق کی شاعری کو ملکی و غیر ملکی سطح پر پزیرائی مل چکی ہے اور دور حاضر کے بڑے بڑے نقاد اور شعراء ناطق کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کے نقاد "شمس الرحمن فاروقی" ناطق کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔ افتخار عارف، فہمیدہ ریاض، زیف سید، ظفر اقبال وغیرہ ناطق کی شاعری کے معترف ہیں۔ ناطق نے نظم، غزل، قصیدہ، سلام، نوحہ اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔

نثر میں ناطق نے ناول، افسانہ، مرقع، تنقید اور کہانیاں لکھیں ہیں اور ان کا چرچہ انڈیا، امریکہ اور دوسرے ممالک میں ہے کہ وہاں ناطق کی کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ناطق کے افسانوں کی کتاب کو "یوبی ایل" ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور دیگر کئی چھوٹے بڑے ایوارڈ شاعری اور نثر میں ناطق کے نام ہو چکے ہیں۔ ایک تخلیق کار کا اتنی جہات میں کام کرنا اور ان تمام میں اپنا لوہا منوانا اتنی عام بات نہیں۔ ناطق کا پہلا مجموعہ دس سال پہلے آیا تھا اور اس دس سال کے عرصے میں ناطق نے تقریباً ہر صنف سخن میں اپنی تخلیق پیش کی۔ وہ مولا علی کے ماننے والے ہیں اور ان کی نظم و نثر میں ان کے جذبات و کیفیات اور عقیدت نظر آتی ہے۔

جہاں ناطق نے اتنے کم عرصے میں اتنی تیزی سے ترقی کی اور ان کے چاہنے والے دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں وہیں ان کے دشمنوں کی تعداد میں بھی کافی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ راقمہ کو تحقیق کے دوران پیش آنے والے مسائل میں ایک

مسئلہ یہ بھی تھا کہ ناطق کے بارے میں لوگ دروغ گوئی اور بغض سے کام لیتے ہوئے ٹھیک معلومات فراہم کرنے سے کتراتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ چند لوگ جو ناطق کو اپنا ادبی حریف مانتے ہیں ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح کام میں رکاوٹ ڈالی جائے اور اسے مکمل نہ ہونے دیا جائے۔ علی اکبر ناطق کی شخصیت کے باب کے لیے راقمہ نے دور حاضر کے ناقدین اور ناطق کے ہم عصر ادیبوں سے رابطہ کیا مگر بیشتر نے ناطق کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہ کیا اور ان کے فن کو بھی نہیں سراہا۔ مگر ناطق کے فن کا منہ بولتا ثبوت ان کے ایک اک کتاب کے آٹھ آٹھ ایڈیشن ہیں۔ سنجیدہ قاری ناطق کو پڑھنا چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے۔

موجودہ ملکی وغیر ملکی صورتحال بوجہ "کرونا" وبا، تمام لائبریریاں اور کتب خانے اور جامعات بند ہونے کی وجہ سے اس تحقیقی مقالے کو مکمل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ڈاکٹر مختار عزمی اور علی اکبر ناطق کی رہنمائی اور شفقت کے سبب یہ مقالہ اپنے مقررہ وقت پر مکمل ہو سکا۔

یہ مقالہ بعنوان "علی اکبر ناطق کی ادبی جہات" علی اکبر ناطق کی "نو" کتابوں کی مکمل تحقیق اور تجزیے کے بعد مکمل ہوا ہے۔ اس مقالے کی تیاری میں بے شمار کتاب کا عمل دخل ہے کہ ناطق ناطق نے نظم، غزل، افسانہ، ناول، مرقع، تنقید کی کتب لکھی ہیں ہر صنف کی روایت اور ناطق کے فن سے موازنے کے لیے بے شمار کتب کا سہارا لینا پڑا۔ جن میں لغات، رسائل، تنقیدی کتب، جریدے، عروض کی کتابیں شامل ہیں۔ کتب کی فہرست درج ذیل ہے۔

بنیادی ماخذ:

(۱) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۳) یاقوت کے ورق، کراچی، آج پبلیکیشنز
(۲) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) ریشم بننا کھیل نہیں، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز
(۳) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) سبز بستیوں کے غزال، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز
(۴) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۸) قائم دین، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز
(۵) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۷) شاہ محمد کا ٹانگہ، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز
(۶) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۴) نولکھی کوٹھی، لاہور، سانجھ پبلیکیشنز
(۷) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۹) فقیر بستی میں تھا، لاہور، عکس پبلیکیشنز
(۸) ناطق، علی اکبر (۲۰۱۶) ھئیت شعر، اسلام آباد، اسوۃ کالج

ثانوی ماخذ:

(۹) سہیل، احمد (۲۰۱۹) ساختیات، تاریخ نظریہ اور تنقید تاریخ، لاہور، بک ٹاک
(۱۰) عباس بلوچ، سہیل (۲۰۰۸) اردو شاعری میں اصلاح سخن کی روایت، لاہور، مجلس ترقی ادب
(۱۱) علی خاں، ارشاد (۲۰۰۰) جدید اصولِ تنقید، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز
(۱۲) ناشاد، ارشد محمود (۲۰۱۲) اطراف تحقیق، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز
(۱۳) وحید، ارشد (۲۰۱۷) ناول کا فن از میلان کنڈیرا، اسلا ماباد، اکادمی ادبیات پاکستان
(۱۴) احمد، اشتیاق (۲۰۰۵) علامت کے مباحث، لاہور، بیت الحکمت
(۱۵) انصاری، بزمی (۱۹۳۹) امیر العروض، دہلی، دہلی فکشن ہاؤس
(۱۶) جمال، انور (۲۰۱۲) ادبی اصطلاحات، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن
(۱۷) ناگی، انیس (۱۹۹۰) شعری لسانیات، کراچی، فیروزسنز
(۱۸) الغنی، نجم (۱۹۸۹) بحر الفصاحت (پرانے نسخے کا عکسی ایڈیشن) لاہور، مقبول اکیڈمی

(۱۹) رئیس، قمر (۲۰۰۱) معاصر اردو غزل، دہلی، اردو اکادمی

(۲۰) صدیقی، ابو اللیث (۲۰۰۴) جامع القواعد (حصہ صرف) لاہور، اردو سائنس بورڈ

(۲۱) جالبی، جمیل (۲۰۰۶) ایلیٹ کے مضامین، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

(۲۲) معین رضوی، حمیدہ (س ن) تخلیقی تنقید؛، اسلام آباد، کاروانِ ملت پبلی کیشنز

(۲۳) انجم، خلیق (۲۰۱۷) متنی تنقید، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان

(۲۴) سوپوری، شفقف (۲۰۱۲) موسیقی شاعری اور لسانیات، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

(۲۵) سرن کیف، سرسوتی (۲۰۰۴) فرہنگِ ادب اردو، دہلی، ساہتیہ اکادمی

(۲۶) الہدیٰ، سرور (۲۰۰۶) ادب کی سماجیات، تصور اور تعبیر از منیجر پانڈے، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند

(۲۷) احمد، سکندر (۲۰۱۹) افسانے کے قواعد، لاہور، عکس پبلکیشنز

(۲۸) احمد، سہیل (۱۹۸۲) طرزیں؛ قوسین، لاہور

(۲۹) احمد، سہیل (۲۰۰۹) مجموعہ سہیل احمد خاں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز

(۳۰) عباس بلوچ، سہیل (۲۰۰۹) تفہیمی تنقید، فیصل آباد، مثال پبلیشرز

(۳۱) عبداللہ، سید (۱۹۸۷) ادب و فن، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

(۳۲) ردولوی، شارب (۲۰۱۴) معاصر اردو تنقید، دہلی، اردو اکادمی

(۳۳) لکھنوی، عشرت (۱۹۳۴) شاعری کی چوتھی کتاب، لکھنؤ، نامی پریس لکھنؤ

(۳۴) فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۰۵) شعر غیر شعر اور نثر، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

(۳۵) فاروقی، شمس الرحمٰن (۱۹۹۸) شعریات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

(۳۶) فاروقی، شمس الرحمن (س ن) تنقیدی افکار، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

(۳۷) حنفی، شمیم (۲۰۰۸) جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

(۳۸) کلیم، صدیق (۲۰۰۷) فکرِ سخن، لاہور، مجلس ترقی ادب

(۳۹) سعید، طارق (۱۹۹۸) اسلوب اور اسلوبیات، لاہور، نگارشات

(۴۰) صدیقی، ظہیر احمد (س ن) تنقید و تحقیق ادبیات، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف فارسی

(۴۱) صدیق، عابد (۱۹۹۳) مغربی تنقید کا مطالعہ، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

(۴۲) چند، گیان (۱۹۸۵) عام لسانیات، نئی دہلی، ترقی بیورو نئی دہلی

(۴۳) بریلوی، عبادت (۱۹۸۹) شاعری کیا ہے، لاہور، ادارہ ادب و تنقید

(۴۴) بریلوی، عبادت (۱۹۸۳) ادب اور ادبی قدریں، لاہور، ادارہ ادب و تنقید

(۴۵) ہاشمی، عبدالرحمٰن (س ن) شعریات اقبال، لاہور، سفینۂ ادب

(۴۶) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (ادب و تنقید کے مسائل) جلد ۹، لاہور، فکشن ہاؤس

(۴۷) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (تصورت) جلد ۸، لاہور، فکشن ہاؤس

(۴۸) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (جدیدیت، مابعد جدیدیت) جلد ۵، لاہور، فکشن ہاؤس

(۴۹) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (رجحانات و تحریکات) جلد ۷:، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۰) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (مارکسیت، نومارکسیت، ترقی پسندی) جلد ۴:، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۱) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (اضافی تنقید، ادبی اصناف کا تنقیدی مطالعہ) جلد ۱۰، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۲) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (تنقید کی اصطلاح، بنیادی، متعلقات) جلد ۱، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۳) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (ساختیات، پس ساختیات) جلد ۶، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۴) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (مغربی شعریات: مراحل و مدارج) جلد ۲:، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۵) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) تنقید کی جمالیات (مغربی شعریات اور اردو تنقید کا ارتقاء) جلد ۳، لاہور، فکشن ہاؤس

(۵۶) عتیق اللہ، پروفیسر (۲۰۱۸) مغرب میں تنقید کی روایت، لاہور، عکس پبلیکیشنز

(۵۷) آراء، عفت (۲۰۱۱) نظری تنقید، مسائل و مباحث، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

(۵۸) شاہد بھنڈر، عمران (۲۰۱۸) مابعد جدیدیت اور امتزاجی تنقید، لاہور، عکس

(۵۹) چشتی، عنوان (س ن) اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، لاہور، خلیق مرکز

(۶۰) فتح پوری، فرمان (۱۹۹۷) اردو شاعری کا فنی ارتقاء، لاہور، الوقار پبلی کیشنز

(۶۱) دہلوی، صغیر (۱۹۸۵) فنون ادب، پشاور، منظور عام پریس

(۶۲) فیروز الدین، فیروز اللغات، لاہور، فیروز سنز

(۶۳) بخش، الہیٰ (۱۹۹۵) کشاف اصطلاحات لسانیات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

(۶۴) حفیظ صدیقی، ابوالعجاز (۱۹۷۵) کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدر قومی زبان

(۶۵) نارنگ، گوپی چند (۲۰۰۲) اردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

(۶۶) نارنگ، گوپی چند (۲۰۱۵) نیا اردو افسانہ، دہلی، اردو اکادمی

(۶۷) نارنگ، گوپی چند (۲۰۱۱) ادب کا بدلتا منظر نامہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، دہلی، اردو کادمی

(۶۸) نارنگ، گوپی چند (۱۹۹۴) ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز

(۶۹) نارنگ، گوپی چند (۱۹۸۹) ادبی تنقید اور اسلوبیات، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

(۷۰) کمال، اشرف (۲۰۱۷) اصطلاحات، کراچی، بک ٹائم

(۷۱) رازی، ارشد (۲۰۰۵) سائنس اور شعری جمالیات، لاہور، مشعل بکس

(۷۲) کمال، اشرف (۲۰۱۶) تنقیدی تھوری اور اصطلاحات فیصل آباد، مثال پبلشرز

(۷۳) عسکری، حسن (۱۹۹۸) عسکری نامہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

(۷۴) عسکری، حسن (۲۰۰۸) مجموعہ محمد حسن عسکری۔ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

(۷۵) شاہد، حمید (۲۰۱۶) اردو: فکشن نئے مباحث، فیصل آباد، مثال پبلیشرز

(۷۶) جالبی، جمیل (۱۹۹۳) ارسطو سے ایلیٹ تک، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن

(۷۷) فاروقی، شمس الرحمن (۲۰۰۶) اردو نظم ۱۹۶۰ کے بعد، دہلی، اردو اکادمی

(۷۸) آغا، وزیر (۱۹۷۴) نظم جدید کی کروٹیں، لاہور، مکتبہ میری لائبریری

(۷۹) الایمان، اختر (۱۹۶۵) جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، مضمون مشمولہ "نگار"، کراچی، جدید شاعری نمبر سالنامہ جولائی اگست

(۸۰) گورکھپوری، مجنوں (۱۹۶۵) جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، مضمون مشمولہ "نگار"، کراچی، جدید شاعری نمبر سالنامہ جولائی

(۸۱) کاشمیری، حامد (س۔ن) اردو نظم کی دریافت، سری نگر، میزان پبلیشرز

(۸۲) صدیقی، عقیل احمد (۱۹۹۰) جدید اردو نظم، نظریہ و عمل، علی گڑھ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس

(۸۳) اعظمی، خلیل الرحمن (۱۹۶۹) غزل کی جدیدیت، مشمولہ (جدیدیت تجزیہ و فہیم) لکھنؤ، نسیم بک ڈپو

(۸۴) حالی، الطاف حسین (۲۰۰۹) مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، مشتاق بک کارنر

(۸۵) اردو لغت (۲۰۱۳) تاریخی اصول پر، جلد چہار دہم، کراچی، اردو لغت بورڈ فرخ، اعجاز (۲۰۱۴) فیض شناسی، لاہور، سنگ میلپبلی کیشنز

(۸۶) احمد دہلوی، سید (۱۹۸۷) فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ

(۸۷) وقار عظیم، سید (۱۹۶۱) داستان سے افسانے تک (مرتبہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد)، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن

(۸۸) شیریں، ممتاز (۱۹۳۶) معیار، لاہور، نیا ادارہ

(۸۹) سندھیلوی، سلام (۱۹۶۴) ادب انتقیدی مطالعہ، لاہور، مکتبہ میری لائبریری

(۹۰) وزیر آغا، ڈاکٹر (۱۹۷۲) نئے مقالات، سرگودھا، مکتبہ اردو زبان

(۹۱) احمد فیض، فیض (۱۹۹۰) ہمارے افسانے، مشمولہ (مقالات فیض) لاہور، فیروز سنز

(۹۲) منظر، شہزاد (۱۹۸۲) جدید اردو افسانہ، کراچی، منظر پبلی کیشنز

(۹۳) قاسمی، ابوالکلام (۲۰۱۸) شاعری کی تنقید، لاہور، عکس پبلیکیشنز

علی اکبر ناطق کی ادبی جہات
یہ مقالہ
صباحت عروج
رول نمبر:26، سیشن: 19-2017 عنواں
نے برائے حصول ڈگری ایم فل اردو
منہاج یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)
میں پیش کیا
MINHAJ UNIVERSITY LAHORE
یہ تحقیقی کام زیر نگرانی
ڈاکٹر نثار احمد عزمی
مکمل ہوا۔